تدبّر

لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی
- حاشیہ : مشتمل بر افادہ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20X30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

1- تدبر حدیث شرح صحیح بخاری (جلد اول)

2- تدبر حدیث شرح موطا امام مالک (جلد اول)

از

مولانا امین احسن اصلاحی

- ترتیب و تدوین : خالد مسعود، سعید احمد، سید اسحاق علی
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز 20X30/8 صفحات 580 ، 544
- قیمت 360 روپے، 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ، سمن آباد لاہور

ملنے کا پتہ: دار التذکیر رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

تدبّر لاہور

جاری کردہ

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

شمارہ 77

ستمبر 2002ء

رجب 1423ھ

مجلس ادارت

عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)

محبوب سُبحانی

سعید احمد

سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے

سالانہ 50.00 روپے

بیرون ملک 250.00 روپے

(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ

اجتماعی دانش کو بروئے کار لانے کی ضرورت 3
محبوب سبحانی

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ 7
حمید الدین فراہیؒ / ڈاکٹر عبداللہ فراہی

تدبر حدیث

درس صحیح بخاری 16
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی

درس موطا امام مالک 30
امین احسن اصلاحی / ماجد خاور

مقالات

رسول اللہ کی بعثت عام اور ختم نبوت 42
خالد مسعود

مراسلہ و مذاکرہ

اللہ تعالیٰ کی صفت تکبر کا مفہوم اور اس کا تقاضا 48
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

محبوب سبحانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتماعی دانش کو بروئے کار لانے کی ضرورت

عالم اسلام اس وقت سخت اضطراب میں مبتلا ہے۔ دنیا کی آبادی کے پانچویں حصہ سوا ارب مسلمانوں کو دنیا کے کسی خطہ میں اطمینان و سکون میسر نہیں۔ بیشتر مسلمان ملکوں کے اندر آبادی کا بہت بڑا حصہ غربت و افلاس، جہالت، بیماری اور بے روزگاری کے آزار میں مبتلا ہے۔ ان ممالک کے تقریباً ۸۰ فیصد وسائل پر ۱۸ فیصد مسلمان ہی قابض ہیں۔ تیل کی دولت سے مالا مال ملکوں نے مسلمانوں کی مدد کرنے کی بجائے اپنی دولت امریکہ، برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں جمع کرنے کو ترجیح دی۔ اب ان ملکوں کی آزادی اور خودمختاری کو بھی گھن لگ چکا ہے۔ خلیج کی جنگ کے بعد ان ممالک کی آزادی امریکہ کے پاس رہن رکھی جا چکی ہے۔ دنیا کے بیشتر علاقوں میں مسلمان ظلم و ستم اور درندگی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ بوسنیا کے مسلمانوں کو انتہائی بے دردی سے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ ان کے وطن کی سرزمین کو ان ہی کے خون سے لالہ زار بنا دیا گیا۔ یوگوسلاویہ کی فوج اور رضاکاروں کو سور ذبح کرنے کی تربیت دی گئی تاکہ بوسنیا کے مسلمانوں کو ذبح کیا جا سکے۔ فلسطینیوں پر اسرائیلی مظالم، وحشت اور درندگی کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔ اسرائیل جب چاہتا ہے فلسطینی مسلمانوں پر ٹینک چڑھا کر ان کو شہید اور ان کی املاک کو ملیا میٹ کر دیتا ہے، حتیٰ کہ بچوں کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ اسرائیل کے موجودہ وزیراعظم ایرل شیرون نے چند سال قبل لبنان میں شطیلہ اور صابرہ میں فلسطینی کیمپوں پر رات کے اندھیرے میں حملہ کر کے دو ہزار سے زائد فلسطینیوں کو شہید کر دیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں 8 لاکھ بھارتی فوج نے 80 ہزار سے زائد کشمیریوں کو شہید کر دیا ہے۔ جن میں عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان سب ہی شامل ہیں۔ ہزاروں املاک تباہ کر دی گئی ہیں۔ سینکڑوں عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ نوجوانوں کے ہاتھ اور پاؤں کی ہڈیاں توڑ دی گئیں۔ انتہائی افسوسناک امر یہ ہے کہ بعض مسلمان ملکوں میں بھی مسلمان محفوظ نہیں۔ الجزائری فوج نے ہزاروں افراد کو اسلام کا نام لینے کے جرم میں شہید کر دیا۔ مصر میں اخوان المسلمون اور اسلام کی سربلندی کے لیے کام کرنے والوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور سینکڑوں مسلمانوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ یہ سب کچھ غیر ملکی آقاؤں کے ایما پر ان کو خوش کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ترکی میں کچھ عرصہ قبل حالات دین پر عمل کی موافقت میں ہوتے جا رہے تھے لیکن اب وہاں اسلام کا نام لینا پھر سے جرم بنتا جا رہا ہے۔ ترکی پارلیمنٹ

کی ایک منتخب خاتون رکن جب حجاب پہن کر پارلیمنٹ میں گئی تو پورے ملک میں اس کے خلاف شور مچ گیا۔ ایک عورت کے حجاب نے ترکی کے سیکولرازم کو ہلا کر رکھ دیا۔ چنانچہ اس خاتون کو ملک سے نکال کر سیکولرازم کو محفوظ کیا گیا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کام کرنے والے سابق وزیر اعظم نجم الدین اربکان پر انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اسی طرح اعتدال پسند مسلمان رہنما طیب اردگان پر بھی الیکشن لڑنے پر پابندی عائد کی جا چکی ہے۔ نفاذ اسلام کے لیے کام کرنے والی سیاسی جماعتوں رفاہ پارٹی اور فضیلت پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ سنکیانگ کے مسلمانوں پر بھی مظالم کیے جا رہے ہیں۔ چیچنیا کی مسلمان حکومت روس اور مغربی ملکوں کو بری طرح کھٹک رہی ہے۔ روس نے اس پر کئی بار حملہ کر کے اس کو تباہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اس وقت امریکہ عراق کے تیل کے ذخائر پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس پر حملہ کر کے اپنی پٹھو حکومت کے قیام کے لیے وہ خلیج میں جنگی ساز و سامان جمع کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے مسلمان ملک بحرین میں اپنے فوجی اڈہ کو بھی استعمال کرے گا۔ برطانیہ کے سوا دنیا کے تمام ملک امریکہ کی مخالفت کر رہے ہیں حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان بھی، جو امریکہ کے مرغ دست آموز ہیں، امریکی حملے کے مخالف ہیں۔ لیکن امریکہ طاقت کے نشہ میں بدمست ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ دنیا کی مخالفت کی اس کو کوئی پروا نہیں۔ اس صورت حال پر عرب لیگ اور 54 مسلمان ملکوں کی اسلامی کانفرنس نے صرف تشویش کا اظہار کیا ہے۔ امریکہ کے اس طرز تغافل پر مسلمان ملک صرف عرض تمنا کر رہے ہیں۔ پچھلے سال ۱۱ ستمبر کو نیویارک میں ٹریڈ سنٹر پر حملہ کی ذمہ داری اسامہ بن لادن اور ان کی تنظیم القاعدہ کے سر تھوپ کر افغانستان کو کھنڈر بنا دیا گیا۔ ہزاروں شہریوں کو شہید کر دیا گیا۔ سینکڑوں مکانات، دکانیں اور مساجد تباہ کر دی گئیں۔ امت مسلمہ صرف تماشائی بنی رہی۔ طالبان کی حکومت کو ختم کر کے اپنی پسند کی حکومت قائم کر دی گئی۔ طالبان کی حکومت نے ملک میں امن قائم کر دیا تھا اور اپنے فہم کے مطابق شریعت کے نفاذ کے لیے بھی کوشاں تھی۔ اسی سال بھارت کے صوبہ گجرات میں سرکاری سرپرستی میں ہندو غنڈوں نے ڈھائی ہزار مسلمانوں کو مظلومانہ شہید کر دیا۔ ان کی املاک جلا دی گئیں۔ درجنوں مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ حاملہ خواتین کے پیٹ پھاڑ دیے گئے۔ جان بچانے کے لیے انھیں ہندو بننے کی دعوت دی گئی۔ یہ خونی ڈرامہ رچانے کے لیے گودھرا کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کے ایک ڈبہ کے اندر ہندوؤں نے آگ لگا دی اور اس کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ اس خونریزی پر عالم اسلام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ صرف پاکستان میں بعض تنظیموں نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ حالانکہ عرب ممالک تیل بند کرنے یا

تجارتی تعلقات ختم کرنے کی صرف دھمکی ہی دے دیتے تو بھارت راہ راست پر آ جاتا۔

سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی اس حالت کی وجہ عالم اسلام کا افتراق و انتشار ہے۔ مسلم ممالک کے باہمی اختلافات کو امریکہ اور اس کے حواریوں نے اس قدر بڑھا دیا ہے کہ ان کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے جس کی وجہ سے ان میں تصادم بھی ہوتا رہتا ہے۔ خلیج کی جنگ میں امریکہ نے عراق، سعودی عرب اور کویت کے رہنماؤں کو بے وقوف بنایا اور عراق پر حملہ کر کے دو لاکھ عراقی عوام کو ہلاک کر دیا۔ بچوں کے دودھ کی فیکٹریاں، اسکول اور ہسپتال تک کھنڈر بنا دیے گئے۔ امریکہ نے سعودی عرب اور کویت کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کر لیا اور سعودی عرب میں اپنی فوجیں مستقل طور پر تعینات کر دیں۔ قبل ازیں عراق اور ایران کو آٹھ سال تک لڑایا جاتا رہا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر مختلف خطوں میں مسلمانوں نے اپنے حقوق کے لیے ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ اس سلسلہ میں مختلف جہادی تنظیمیں وجود میں آ گئی ہیں۔ خاص طور پر فلسطین اور مقبوضہ کشمیر کے مسلمان اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ مزید براں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات پر خودکش حملے شروع کر دیے ہیں۔ عیار مغربی ملکوں نے اس موقع پر فائدہ اٹھا کر اسلام کو دہشت گرد مذہب قرار دینا شروع کیا۔ پچھلے سال نیویارک ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور امریکہ نے دنیا کو تقریباً قائل کر لیا کہ اسلام جہاد کے نام پر دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے خلاف صلیبی طرز کی جنگ ضروری ہے جس کی ابتدا کی جا چکی ہے۔ اس کا پہلا نشانہ افغانستان کو بنایا گیا۔ دوسرا نشانہ عراق بننے والا ہے۔ امریکہ میں سعودی عرب کو بدی کا محور قرار دیا جا رہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تیسرا نشانہ سعودی عرب ہوگا۔ اس طرح رفتہ رفتہ تمام مسلمان ممالک کی باری آئے گی۔

غیروں کی چیرہ دستیوں اور اپنوں کی بے حسی کا تقاضا ہے کہ صورت حالات پر اچھی طرح غور و خوض کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں کوئی لائحہ عمل تجویز کیا جائے۔ بدقسمتی سے عالم اسلام میں ایسے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے موجود نہیں ہیں جن کی رائے پر عادلہ سلیمین کو اعتماد ہو اور نہ ہی عالم اسلام میں ایسی کوئی عظیم شخصیت موجود ہے جس پر مسلمان اعتماد کر سکیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے امت مسلمہ کی اجتماعی دانش و بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ اس صورت میں بروئے کار آ سکتی ہے جب ہر فقہ کے علمائے کرام، امت کا درد رکھنے والے مسلمان اور ایسے دانشور حضرات جو مومنانہ بصیرت رکھتے ہوں اور جن پر مسلمانوں کو اعتماد ہو مل بیٹھ کر مسلمانوں کو درپیش چیلنجوں کے مقابلہ کے لیے رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی حکومتیں شاید کوئی بھی اقدام

کرنے کے لیے نااہل ہیں۔ وہ ہر فیصلہ کرتے وقت امریکہ کو قبلہ و کعبہ مان کر اس کے اشاروں پر عمل کرتی ہیں۔ جب امریکہ ہی نے زخم لگائے ہیں تو وہ ان زخموں پر پھاہے کیوں رکھے گا؟

یہ امر قابل ذکر ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں بعض ادارے اور بعض شخصیات انفرادی طور پر اسلام کے متعلق علمی میدان میں تحقیق و جستجو کا کام کر رہے ہیں اور مغربی افکار کے مقابلہ میں قرآنی فکر کو مدون کر کے پیش کر رہے ہیں لیکن یہ بڑا وقت طلب کام ہے۔ اس کے ثمرات اگرچہ دیرپا ہوں گے لیکن بہت تاخیر سے نکلیں گے۔ علمی و فکری میدان میں کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ ﷺ کو رہنما بنا کر فکری کاوش کی جائے۔ ان میں غواصی کر کے قیمتی موتی دین کی حکمت کی صورت میں نکالے جائیں۔ خوش قسمتی سے مولانا حمید الدین فراہیؒ نے قرآن فہمی کے فطری اصول واضح کر کے ان پر اپنی تفسیر نظام القرآن مبنی کی اور ان کے نامور شاگرد مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے انہی اصولوں کی روشنی میں مکمل قرآن کی شاہکار تفسیر ''تدبر قرآن'' لکھ دی ہے جس نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ قرآن کی حکمت کا خزانہ اس کے نظم کو کھولنے اور آیات پر تدبر سے ہاتھ آتا ہے۔ ان کے اس کام کو آگے بڑھانے اور تدبر سے مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام ملت کی اجتماعی دانش کو صحیح خطوط پر ترقی دینے میں کام آ سکتا ہے۔

تاہم بعض مسائل جو امت مسلمہ کو درپیش ہیں وہ فوری حل چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے معاملہ فہم طبقہ کو اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر امت میں افتراق و انتشار کی موجودہ صورت کو اتحاد امت سے بدلنا اور اللہ کی رسی کو اکٹھے ہو کر مضبوطی سے تھامنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے اس عالمی تزویراتی چال کو سمجھنا اور اس کی کاٹ کرنا مسائل کے حل کی جانب اہم پیش رفت ہو گی جس نے مختلف مسلمان ممالک کا ناطقہ تنگ کر رکھا ہے۔ اس عمل میں مومنانہ فراست رہنما ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں میں بین الاقوامی قوانین اور مالیاتی نظام، عالمی تزورات اور مختلف ممالک کی خارجہ پالیسیوں کو سمجھنے والے افراد کم نہیں ہیں۔ اصل مسئلہ ان کو فورم مہیا کرنے اور امت کا درد ان میں پیدا کرنے کا ہے۔

اگر امت مسلمہ کے بڑے لوگوں نے ان مسائل پر فوری توجہ مرتکز نہ کی تو خطرہ یہ ہے کہ امت کا ابتلا زیادہ گمبھیر ہوتا چلا جائے گا اور اس کے دشمن اس کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کرنے کی سعی کریں گے۔ یہ امت اللہ کی زمین پر اس کے نام کا پرچم بلند کرنے اور اس کی مرضی کو نافذ کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ اس نے اگر اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی تو یہ ایک انتہائی خوفناک حادثہ ہو گا۔ پھر اس امت کا وجود اور عدم وجود بے معنی ہو گا۔ خدا ہمیں اس انجام سے بچائے!

مصنف: علامہ حمید الدین فراہیؒ
ترجمہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

تفسیر سورۃ البقرۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمٓ. ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ. اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (۱-۵)

الفاظ کی تشریح:

الٓمٓ: الف۔ لام۔ میم، ہر حرف کو الگ الگ ان کے آخر پر جزم کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اسی انداز سے اس جیسے دوسرے حروف بھی پڑھے جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔ یہ صرف سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ قرآن مجید نے ''ذلک'' اور ''تلک'' سے اشارہ کر کے ہم کو یہ بتا دیا کہ یہ سورتوں کے نام ہیں کیونکہ ان سے عام طور پر ماسبق ہی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ نیز سنت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اگرچہ یہ سورتوں کے نام ہیں لیکن قرآن مجید کا حصہ ہیں کیوں کہ ''ذلک'' اور ''تلک'' کا اشارہ ان ہی کی طرف ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ان کو قرآن کے ساتھ ملا کر پڑھیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ حروف قرآن مجید کے ساتھ نازل ہوئے ہیں اس لیے ان کو چھوڑا نہیں جا سکتا کیوں کہ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل واضح ہے کہ پورا قرآن حرف بحرف بالکل محفوظ ہے اور ہم کو اسے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ حروف ہجا کے نام عربوں کو معلوم تھے اور ان کو وہ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ سورتوں کے یک حرفی نام مثلاً ص، ق، ن عربی مبین میں سے ہیں۔ رہے مرکبات جیسے حم، الم، المص، حم، عسق وغیرہ تو یہ پتہ چل جانے کے بعد کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں جن سے یہ شروع ہوتی ہیں یہ بھی عربی مبین میں سے ہوئے۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ایسے کلمات ہیں جن سے اہل عرب ناواقف تھے تو ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ وہ مرکب حروف سے ہم بناتے تھے اور ان کو خاص معنی کا لباس پہناتے تھے جو ان کے مفردات سے نہیں سمجھے جاسکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے اہم افراد، اپنی اولاد، اپنے گھوڑوں، جھنڈوں اور تلواروں کے خاص خاص نام رکھتے تھے حالانکہ عرب ان ناموں کے وہ معنی نہیں جانتے تھے جن معانی کے لیے وہ وضع کیے گئے تھے بلکہ ان کے عام مفہوم کو وہ جانتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کے استعمالات سے جنہوں نے ان اسماء کو خاص معانی کے لیے وضع کیا تھا سننے والوں کو ان کے نئے مفہوم کا پتہ چل جاتا تھا۔ اسے واضح بیانی یا فصاحت سے خروج نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح یہ پتہ چل جانے کے بعد کہ سورتوں کے لیے یہ نام وضع کیے گئے ہیں انہیں ان ناموں سے موسوم کرنا ان کو عربی مبین کے دائرہ سے باہر نہیں کرتا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ جن اسماء کو عرب خاص خاص معانی کے لیے وضع کرتے تھے ان کے عام اور خاص مدلول کے درمیان کوئی نہ کوئی مناسبت ضرور ہوتی تھی لیکن حروف مقطعات اور ان سورتوں کے درمیان جن میں وہ آئے ہیں کوئی مناسبت ہم کو دکھائی نہیں دیتی، تو ہم کہیں گے کہ یہ ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ نام فلاں مسمی کے لیے خاص ہو گیا ہے اگر ان کے درمیان مناسبت نہ معلوم ہو سکے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ بہت سے اسماء جامدہ کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ ان کے اور ان کے مسمی کے درمیان کیا مناسبت ہے۔ پھر مناسبت سے ناواقفیت اس کی نفی کو مستلزم نہیں ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی چیز بغیر حکمت اور فائدہ کے نہیں بنائی ہے لیکن سارے فوائد ایک ہی دن میں ظاہر نہیں ہو جاتے بلکہ غور و فکر اور علم میں اضافہ کے ساتھ روز بروز چیزوں کے نت نئے فوائد ہمارے سامنے ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ جس چیز کا فائدہ اور نفع ہم پر مخفی ہوتا ہے اس میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں، ناواقفیت کی وجہ سے اس کا انکار نہیں کر دیتے۔ اس طرح علماء نے ان اسماء کی ان کے مسمی کے ساتھ مناسبت پر غور کیا ہے اور فکر کو کام میں لانے ہی سے اس کی تربیت اور تکمیل ہوتی ہے۔ معاملہ جتنا زیادہ گہرا ہوگا اتنا ہی وہ فکر کی کارکردگی کو بڑھائے گا اور یہ اس کی تربیت کے لیے زیادہ مفید ہوگا، اسی طرح نفس کو اپنی معلومات پر دھوکے میں مبتلا ہونے سے روکے گا اور اسے حصول علم پر زیادہ ابھارے گا کیوں کہ احساس جہل تعلیم کی راہ میں پہلا قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علماء پر یہ فضل رہا ہے کہ جتنا زیادہ وہ علم میں آگے بڑھتے جاتے تھے اتنا ہی ان کو ان چیزوں کے بارے میں جنہیں وہ نہیں جانتے تھے اپنے جہل اور کم علمی کا احساس ہوتا جاتا تھا۔

چنانچہ ان اسماء کی مناسبت کے غامض ہونے میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ قرآن مجید کو پڑھنے

والا اس پر پہلی نظر پڑتے ہی سنبھل جاتا ہے کہ یہ کتاب ایک عمیق سمندر ہے اور سوچتا ہے کہ اس کو اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اس پر تدبر کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے کیوں کہ ہر شخص اتنے کا مکلف ہے جتنا کہ اس کے بس میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (سورہ انعام: ۱۶۵)

﴿تاکہ جو کچھ اس نے تم کو عطا کیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔﴾

سولہویں فصل میں ہم ان اسماء اور ان کے مسمیات کے درمیان مناسبت پر کچھ اشارہ کریں گے۔

ذلک: حضرت ابن عباسؓ اور ان کے علاوہ بعض دوسرے سلف سے مروی ہے کہ ذلک الکتاب کے معنی "ھذا الکتاب" کے ہیں[1]۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ یہی کتاب ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور، اور یہ رائے بالکل درست ہے۔ ان کے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ 'ذلک' بمعنی "ھذا" ہے کیونکہ دونوں مفہوموں کے درمیان بڑا فرق ہے، اس کی پوری تفصیل ہماری کتاب مفردات القرآن میں ملے گی یہاں بقدر کفایت بیان کرتے ہیں۔

"ھذا" کا اشارہ اس چیز کی طرف ہوتا ہے جو آپ کے سامنے ہوتی ہے اور اسے آپ مخاطب کو دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حرف "ھا" سے اس کو ظاہر کرتے ہیں تاکہ جو چیز مخاطب کے سامنے ہے اس کو اسے دکھا سکیں یا اس کی طرف متوجہ کرسکیں۔ مثلاً آپ کہتے ہیں "ھا انا ذا" اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ. (قریش: ۳)

﴿تو ان کو چاہیے کہ عبادت کریں اس گھر کے رب کی۔﴾

اگر وہ 'رب ذلک البیت' کہتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ وہ گھر جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ جب کسی چیز کا ذکر پہلے ہو چکا ہو اور اس کی طرف "ھذا" سے اشارہ کیا جائے تو اس کا مقصد اس چیز کو مخاطب کی نظروں کے سامنے لاکھڑا کر دینا ہے۔ یہاں استناد کے لیے نہیں بلکہ بطور مثال ہم فرزدق کے ایک قصیدے سے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطئته والبیت یعرفه والحل والحرم[2]

﴿یہ وہ ہیں کہ بطحائے مکہ ان کے نقش قدم کو پہچانتا ہے۔ بیت اللہ ان کا شناسا اور حل

---

[1] دیکھئے تفسیر طبری ۱: ۲۲۵

[2] دیوان فرزدق: الجزء الثانی: ۲۳۸

وحرم سب ان سے واقف ہیں۔﴾

اسی قصیدہ کے ایک شعر کا ٹکڑا ہے:

هذا التقی النقی الطاهر العلم[1]

﴿خدا ترس پاک طینت و پاکباز اور نامور بزرگ ہیں۔﴾

ایک اور مصرعہ اسی قصیدہ کا ہے:

الی مکارم هذا ینتهی الکرم[2]

﴿ان کی خوبیوں اور نوازشوں پر شرافت اور جود و کرم کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔﴾

امام زین العابدین اس وقت موجود تھے اور شاعر مخاطب کو خفیف کرنے کے لیے اسے ان کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

قرآن مجید میں آیا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ. (بقرہ:۷۹)

﴿پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔﴾

ایک اور جگہ ہے:

قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا (آل عمران:۳۷)

﴿اس نے پوچھا اے مریم یہ چیز تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے﴾

دوسری جگہ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ. (زخرف:۶۴)

﴿بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، اس لیے اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔﴾

حضرت عیسیٰ کی تمثیل بیان کرنے کے بعد فرمایا:

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ. (آل عمران:۶۲)

﴿بے شک یہ سچا بیان ہے۔﴾

[1] اس کا پہلا مصرعہ ہے: هذا ابن خیر عباد الله کلهم

[2] اس کا پہلا مصرعہ ہے: اذ رأته قریش قال قائلها ۲: ۲۳۹

"هذا" سے اشارہ کر کے ان کے سامنے اس واقعہ کو ممثل کر دیا جس کا ذکر پہلے آ چکا تھا۔

نیز فرمایا

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ. (آل عمران:۶۸)

﴿ابراہیم کے ساتھ نسبت کے سب سے زیادہ حق دار وہ ہیں جنھوں نے اس کی اتباع کی اور یہ پیغمبر۔﴾

"هذا" کہہ کر پیغمبر ﷺ کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ ان کے بیچ میں موجود تھے۔

رہے اسماء اشارہ "ذلک"، "تلک" اور "اولئک" تو ان سے آپ اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مخاطب کے علم میں ہوتی ہے اور اس کا ذکر پہلے آ چکا ہوتا ہے، یا اس سے ارفع ہوتی ہے کہ اسے آپ مخاطب کے سامنے پیش کریں، جیسے بات پوری ہو جانے کے بعد آپ کہتے ہیں: "ذلک" یعنی جس بات کا میں نے ذکر کیا ہے اسے گرہ میں باندھ لو، اس پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ۔ (محمد:۴)

﴿یہ سن چکے اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا۔﴾

داؤد علیہ السلام کے ذکر کے بعد فرمایا:

تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ
تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (بقرہ:۲۵۲-۲۵۳)

﴿یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں مقصد کے ساتھ سناتے ہیں اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔﴾

اسی طرح وراثت کے احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا:

تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ (سورہ نساء:۱۳)

﴿یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود ہیں۔﴾

امیہ بن ابی الصلت کہتا ہے:

ترکت اللات والعزی جمیعا — کذلک یفعل الرجل البصیر[1]

[1] تفسیر طبری، ۱:۲۲۷

﴿میں نے لات اور عزیٰ سب کو خیر باد کہہ دیا۔ صاحب بصیرت آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے۔﴾

قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں اور اہل زبان خاص خاص فوائد کے لیے ان کے استعمالات میں فرق کر دیتے ہیں۔

یہاں پر 'ذلک' کے استعمال کا فائدہ یہ ہے کہ وہ یہ بتا رہا ہے کہ سورہ کا نام، جس کا ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے، قرآن مجید کا ایک حصہ ہے کیوں کہ 'ذلک' اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

حٰمٓ عٓسٓقٓ. كَذٰلِكَ يُوحِيْ اِلَيْكَ (شوریٰ:۱۔۳)

﴿یہ سورہ حم عسق ہے۔ اسی طرح تیرا رب تیری طرف وحی کرتا ہے۔﴾

'کذلک' سے اسی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس سے فوراً پہلے ہوا ہے۔

اور نحویوں کا یہ کہنا کہ 'ھذا' اشارہ قریب کے لیے آتا ہے اور ''ذلک'' اشارہ بعید کے لیے تو یہ ان کے قریب تر مفہوم کو بتانے کے لیے انہوں نے کہا ہے، نہ کہ ان کی پوری معنوی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے۔

اور جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابن جریرؒ نے اور ان کی پیروی میں دوسرے مفسرین نے جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہاں ''ذلک'' بمعنی ''ھذا'' ہے اور خفاف بن ندبہ کے اس شعر سے استدلال کیا ہے:

اقول له والرمح یاطر متنه تأمل خفافا اننی انا ذلکا[1]

﴿جب نیزے سے اس کی پشت دہری ہوئی جاتی تھی تو میں اس سے کہہ رہا تھا کہ غور سے دیکھو میں وہی خفاف ہوں۔﴾

تو ان کی یہ بات نہ تو شعر کے مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہے اور نہ آیت ہی کے مفہوم کے اعتبار سے درست کہی جا سکتی ہے۔ جہاں تک آیت کا تعلق ہے ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہاں 'ذلک' جس امر پر دلالت کر رہا ہے اس پر 'ھذا' نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کے تمام نظائر ہماری بات کی تائید میں ہیں جیسا کہ

---

[1] علامہ محمود شاکر نے بھی تقریباً یہی مفہوم تفسیر طبری پر اپنے حاشیہ میں بیان کیا ہے۔ اور آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ: ''و ھذا المعنی یخرج البیت عن ان یکون شاھدا علی ما أراد الطبری'' دیکھئے ۱:۲۲۷

آگے معلوم ہوگا۔ رہا شعر تو اس میں ''ھذا'' بالکل نامناسب ہوتا کیوں کہ شاعر اپنے دشمن کو اپنا نام بتانے کے بعد اس سے کہہ رہا ہے کہ میں تمہارا وہی دشمن ہوں جس کے بارے میں سن چکے ہو اور اسے پہلے سے جانتے ہو۔ اگر وہ 'انسی انا ھذا' کہتا تو یہ معنی نہ پیدا ہوتے اور شعر بھی معیار سے گر جاتا کیوں کہ ذلک سے شاعر کی بڑائی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ''انا ھذا'' کہنے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں۔

الکتاب: یہ کتب کا مصدر ہے اور پانچ معانی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے:

۱۔ نوشتہ تقدیر، جیسا کہ فرمایا ہے:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (انفال:۶۸)

﴿اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو روش تم نے اختیار کی اس کے باعث تم پر ایک عذاب عظیم آ دھمکتا۔﴾

۲۔ اللہ تعالیٰ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز کا ریکارڈ ہے، جیسا کہ فرمایا:

وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ. (ق:۴۰)

﴿اور ہمارے پاس ایک محفوظ رکھنے والا رجسٹر ہے۔﴾

نیز فرمایا ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ. (توبہ:۳۶)

﴿بے شک مہینوں کی تعداد اللہ کے یہاں بارہ مہینے کی ہے اس کے رجسٹر میں۔﴾

ایک اور جگہ ہے:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ. (انعام:۵۹)

﴿اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر وہ ایک کھلے رجسٹر میں درج ہے۔﴾

۳۔ پیغام اور تحریر، جیسا کہ فرمایا ہے:

اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ. (نمل:۲۹)

﴿میرے پاس ایک گرامی نامہ ڈالا گیا﴾

دوسری جگہ ہے: حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ. (بقرہ:۲۳۵)

﴿جب تک مکتوبہ مدت پوری نہ ہو جائے﴾

۴۔ شرائع و احکام، جیسا کہ فرمایا:

وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ. (مائدہ:۱۱۰)

﴿اور یاد کرو جب میں نے تمہیں شریعت کے احکام اور حکمت، اور تورات وانجیل کی تعلیم دی۔﴾

نیز فرمایا:

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ. (بقرہ:۱۲۹، آل عمران:۱۶۴، جمعہ:۲)

﴿اور ان کو شریعت کے احکام اور حکمت کی تعلیم دے۔﴾

۵۔ اللہ کا اتارا ہوا کلام، اس معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا اطلاق کتاب الٰہی پر ہوتا ہے، خواہ اس کا تھوڑا حصہ ہو یا زیادہ، فرمایا ہے۔

وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ. (اعراف:۱۷۰)

﴿جو لوگ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز قائم کرتے ہیں۔﴾

نیز فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِينَ اُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتَابِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ. (آل عمران:۲۳)

﴿کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ عطا ہو۔ ان کو اللہ کی کتاب ہی کی دعوت دی جا رہی ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔﴾

ایک مقام پر فرمایا:

فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ. (یونس:۹۴)

﴿تو تم ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔﴾

اس کی مثالیں بہت ہیں۔

جس طرح کوئی لفظ اپنے مختلف معانی میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر معنی کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے اسی طرح یہ کتاب کا لفظ بھی خاص طور پر کتاب الٰہی کے لیے بولا جانے لگا۔ یہی طریقہ اہل کتاب کے یہاں بھی معروف ہے۔ یہود انبیاء کے صحیفوں میں سے ہر کتاب کو "سفر" کہتے تھے۔ اسی طرح عیسائی مترجموں نے ان کتب مقدسہ کو "بائبل" کا نام دیا جس کے معنی یونانی زبان میں کتاب کے ہیں اور ان کے لیے "Scripture" کا لفظ استعمال کیا جس کے معنی بھی لاطینی زبان میں کتاب ہی کے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کتاب کا لفظ خاص کر کے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے معنی میں قدیم زمانہ سے مستعمل ہے۔ اور قرآن مجید نے تو اپنے استعمالات سے اس کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ اس کے مخاطب اس کے اس مفہوم کو اچھی طرح جان گئے ہیں۔ پھر قرآن مجید نے بہت سے ناموں سے اس کا تعارف کرایا ہے تاکہ اس کے مسمی کا صحیح

تصور ذہنوں میں بٹھا دے۔ پندرھویں فصل میں ہم ان ناموں کا ذکر کریں گے۔ یہاں لفظ کتاب کا یہی پانچواں مفہوم مراد ہے۔

لا ریب فیه: ریب کے معنی شک کے ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے:

اِنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا. (غافر:۵۹)

﴿یقیناً قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔﴾

"ارتاب" کے معنی ہیں اس نے شک کیا، فرمایا ہے:

اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ. (عنکبوت:۴۸)

﴿تب تو یہ جھٹلانے والے ضرور شک کرتے۔﴾

"ریب الدهر" یعنی حوادث روزگار۔ اسی سے "ریب المنون" ہے، جیسا کہ فرمایا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ. (طور:۳۰)

﴿کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے جس کے لیے ہم گردش روزگار کے منتظر ہیں۔﴾

"رابنی فلان" آپ اس وقت کہتے ہیں جب کسی کی طرف سے وہ بات دیکھنے کو ملتی ہے جو آپ کو ناگوار ہوتی ہے یا جہاں سے کسی برائی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی سے "ریبة" بمعنی تہمت نکلا ہے۔ اور تہمت کے معنی بدگمانی کے ہیں جو شک ہی کے قسم کی ایک چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ. (توبہ:۱۱۰)

﴿وہ عمارت جو انہوں نے تعمیر کی ان کے دلوں میں ہمیشہ بدگمانی پیدا کرتی رہے گی۔﴾

"أراب الرجل" کے معنی ہوں گے آدمی شبہ میں مبتلا ہو گیا یا اس نے دوسرے کو شک میں مبتلا کر دیا۔ اسی مفہوم میں "اورث الریب" بھی آتا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

فِىْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ. (سبا:۵۴)

﴿الجھن میں ڈالنے والے شک میں۔﴾

حدیث شریف میں آیا ہے:

دع ما يريبك الى مالا يريبك۔ (سنن ترمذی، آخر ابواب القیامۃ۔ نیز فتح الباری ۴:۲۹۱)

﴿جس کام میں تمہیں شبہ ہوا سے چھوڑ کر وہ کام کرو جس جانب سے تمہارے دل میں کوئی خلش نہ ہو۔﴾

امین احسن اصلاحیؒ

درس صحیح بخاری

(کتاب المزارعة کی روایات)

باب: اذا قال اکفنی مؤنة النخل او غیره و تشرکنی فی التمر.

باب: جب ایک شخص یہ کہے کہ آپ میرے نخلستان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے کر پھل میں میرے شریک ہو جائیں۔

وضاحت: مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو نخلستان کی یا باغ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دیتا ہے تو وہ اس کو پھل میں حصہ دار بنا سکتا ہے۔ حصہ کیا ہوگا۔ اس کا تعلق حالات پر ہے۔ باغ ایسی جگہ ہے جہاں نہر کا پانی آسانی سے دستیاب ہے تو دیکھ بھال کی ذمہ داری میں حصہ کچھ اور ہوتا ہے اور پانی مشکل سے ملتا ہے اور زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے تو حصہ زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نصف کا حصہ دار ہوگا لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ حالات پر اس کا انحصار ہوگا اور عقل کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اگر کھیتی میں کوئی شریک ہو تو بیج کا بھی سوال ہوتا ہے تو اس شکل میں بھی حصہ میں تبدیلی ہوگی۔

❁ **حدثنا الحکم بن نافع اخبرنا شعیب حدثنا ابو الزناد عن الاعرج عن ابی هریرةؓ قال قالت الانصار للنبی ﷺ اقسم بیننا و بین اخواننا النخیل قال لا فقالوا تکفونا المؤنة و نشرککم فی الثمرة قالوا سمعنا و اطعنا.**

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انصار نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ ہمارے نخلستان ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیجیے تو آپؐ نے فرمایا نہیں (میں ایسا نہیں کروں گا) اس پر انصار نے مہاجرین سے کہا کہ آپ لوگ دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھائیں گے اور ہم آپ کو پیداوار میں شریک کریں گے تو مہاجرین نے کہا ہمیں قبول ہے۔

وضاحت: اس روایتؓ میں موقع و محل حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جب مہاجرین مدینہ

آئے تو آنحضرت ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان مواخات قائم کی۔ اب سوال یہ تھا کہ ان لوگوں کے گزارے کی کیا شکل ہوگی۔ تو انصار نے بڑھ کر یہ پیش کش کی کہ ہمارے نخلستان دونوں کے درمیان تقسیم کر دیے جائیں۔ یہ بات تو ضروری تھی کہ مہاجروں کے حق دار ہونے کے باعث ان کی مدد کی جائے لیکن مدد کی ایسی شکلیں بھی اختیار کی جا سکتی تھیں جو وقتی اور عارضی ہوں کہ جب حالات سنبھل جائیں تو ان کو بدل دیا جائے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کے لیے زمینداریاں تقسیم کر دی جائیں۔ انصار نے تو زمین تقسیم کرنے کی پیش کش کر دی اور ان کے شایان شان بات یہی تھی لیکن آنحضرت ﷺ نے کہا کہ نہیں، بات اس حد تک نہیں بڑھانی ہے کہ ان لوگوں کو جائیداد میں شریک کر دیا جائے۔ بلکہ موجودہ حالات میں ان کی مدد مقصود ہے۔ تب انصار نے بڑی فیاضی سے کہا کہ یہ ہمارے نخلستان ہیں۔ ان کی دیکھ بھال یہ کریں، پھل میں ہم ان کو شریک کر لیں گے۔ یہ تجویز معقول تھی، اس لیے مہاجرین نے اس کو مان لیا۔ کئی روایات ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مواخات کے باوجود مہاجرین نے انصار پر انحصار حتی الوسع کم کیا۔ اس روایت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے کھیتوں میں محنت کرنے کی راہ اختیار کی۔

باب: قطع الشجر و النخل و قال انسؓ امر النبی ﷺ بالنخل فقطع.

باب: درختوں اور کھجوروں کا کاٹنا۔ اور انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تو کھجور کے درخت کاٹے گئے۔

❁ **حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل حدثنا جویریة عن نافع عن عبداللهؓ عن النبی ﷺ انه حرق نخل بنی نضیر و قطع و هی البویرة ولها یقول حسانؓ،**

و هان علی سراة بنی لوی حریق بالبویرة مستطیر.

ترجمہ: عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے بنی نضیر کے کھجور کے درختوں کو جلایا اور کاٹا۔ اس باغ کا نام بویرہ تھا اور اس کے بارے میں حسانؓ کا ایک شعر ہے کہ بنی لوی کے سرداروں کے لیے بویرہ میں کھجوروں کے پھیلے ہوئے درختوں کو جلا دینا آسان ہو گیا تھا۔

وضاحت: غزوہ احد کے بعد یہودی قبیلہ بنو نضیر پر حملہ کیا گیا تو آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر کھجوروں کے کچھ درخت کاٹنے کا حکم دیا اور کچھ کے جلانے کا۔ یہ جنگی مصلحت کا تقاضا تھا۔ اس پر پروپیگنڈہ کرنے

والوں کو موقع مل گیا کہ بنونضیر کی دشمنی میں اچھے بھلے درختوں کو کٹوا دیا گیا۔ قرآن مجید میں سورہ حشر میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ کھجوروں کو کٹوانے کی جو کارروائی کی گئی تو وہ اللہ کے حکم سے کی گئی۔ چونکہ کفار کا اعتراض پروپیگنڈے کے پہلو سے نازک تھا اس لیے خود قرآن مجید نے اس کا جواب دیا کہ پروپیگنڈا کرنے والوں کا منہ بند کیا جائے اور عام مسلمان اس سے متاثر نہ ہوں۔

باب کی عبارت میں کھجور کا درخت جلانے اور کاٹنے کا ذکر ہے۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ کھجور کے درخت تو کٹتے ہی رہتے تھے۔ جلانے اور تعمیر مکان کے لیے ان کے تنے استعمال ہوتے تھے۔ باب یہ ہونا چاہیے تھا کہ کیا کسی جنگی مصلحت کے تحت دشمن کے کھجور یا باغ کٹوائے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ اس صورت میں باب اور روایت میں مناسبت ہوتی۔ بہرحال آنحضرت ﷺ نے بنونضیر کے جو درخت کٹوائے تھے اس کی شان نزول اور ہے۔ یہاں باب سے وہ بات نہیں نکلتی۔

یہ روایت حضرت عبداللہؓ سے ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عبداللہ نام کے کئی صحابہ میں سے یہ کون تھے۔

❁ حدثنا محمد بن مقاتل اخبرنا عبدالله اخبرنا يحيى بن سعيد عن حنظلة بن قيس الانصارى سمع رافع بن خديج قال كنا اكثر اهل المدينة مزدرعا كنا نكرى الارض بالناحية منها مسمى لسيد الارض قال فمما يصاب ذالك و تسلم الارض و مما يصاب الارض و يسلم ذالك فنهينا و اما الذهب والورق فلم يكن يومئذ.

ترجمہ:۔ حنظلہ بن قیس راوی ہیں کہ انہوں نے رافع بن خدیج سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مدینہ کے بڑے زمیندار تھے۔ ہم زمین کرایہ پر دیتے تھے اس شرط پر کہ زمین کے ایک معین حصے کی پیداوار مالک زمین کی ہوگی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ حصہ تو آفت زدہ ہو جاتا اور باقی زمین بچ رہتی تھی اور کبھی ایسا ہوتا کہ زمین آفت زدہ ہو جاتی اور وہ ٹکڑا محفوظ رہتا۔ تو ہم کو اس معاملہ سے روک دیا گیا۔ سونے اور چاندی کا رواج اس زمانے میں نہیں تھا۔

وضاحت:۔ اس روایت کی بنیاد پر لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں مزارعت جائز نہیں ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس روایت سے یہ بات نہیں نکلتی۔ یہاں شکل یہ ہے کہ مالک کسی شخص سے یہ طے کر لیتا ہے

کہ ایک مخصوص خطے کی پیداوار میری ہوگی اور باقی زمین کی پیداوار تمہاری، اس شرط پر کھیتی کرو۔ اس طرح کے معاملہ سے منع کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا مسلم اصول ہے کہ جہاں ضرر وغرر ہوگا، وہ کاروبار درست نہیں ہے۔ معاملہ کی اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے رقبہ میں فصل اچھی ہو جائے، مثلاً دھان میں ایسا ہوتا ہے کہ جس خطے میں پانی اچھا ملا وہاں فصل خوب ہوئی، دور کھیتی کرنے والے کے حصہ میں فصل خراب ہو گئی۔ مزارعت میں رقبہ مخصوص نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ بھی پیداوار ہوتی ہے اس میں مالک زمین اور کرایہ دار حصہ دار اور نفع نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہاں دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اپنا حصہ آپ نقد وصول کر لیتے ہوں تو اس میں ضرر وغرر دونوں ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے تو نقد وصول کر لیا۔ فصل اگر ماری جائے تو مزارع کو نقصان ہو جائے گا۔ اس پر میں بحث کر چکا ہوں کہ اس کا حل یہ ہے کہ نقصان کا لحاظ کیا جائے گا۔ اگر نقصان ایک تہائی سے کم ہے تو از روئے شریعت قابل درگذر ہے اور اگر ایک تہائی سے زیادہ ہوگا تو اس کی تلافی کی جائے گی۔

بعض لوگ مدافعت میں وہ روایت پیش کرتے ہیں کہ جس مسلمان کے پاس زمین ہے اس کے لیے اولیٰ ہے کہ خود کھیتی کرے اور اگر نہیں کرتا تو اپنے کسی بھائی کو دے دے کہ وہ کھیتی کرے۔ ان کے مطابق یہ روایت مزارعت کے منافی ہے۔ اس کو سمجھنے میں بھی ان سے غلطی ہوئی ہے۔ بطور موعظت اور نصیحت کے یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر وہ خود کاشت نہیں کر رہا ہے تو یہ بڑی نیکی ہوگی کہ زمین کاشت کے لیے اپنے کسی بھائی کو دے دے۔

روایت کے آخر میں یہ جو آیا ہے کہ اس وقت سونے چاندی کا رواج نہیں تھا تو مطلب یہ ہے کہ پیداوار کی تقسیم کے معاملات میں تبادلہ کے طور پر ان کا استعمال اس دور میں نہیں تھا۔ جنس کا جنس سے ہی لین دین ہوتا تھا۔

باب: المزارعة بالشطر و نحوه.

و قال قيس بن مسلم عن ابى جعفر قال ما بالمدينة اهل بيت هجرة الا يزرعون على الثلث والربع و زارع علىؓ و سعد بن ابى وقاصؓ و عبدالله بن مسعودؓ و عمر بن عبدالعزيز و القاسم و عروة و آل ابى بكرؓ و آل عمرؓ و آل علىؓ و ابن سيرين و قال عبدالرحمن بن اسود كنت اشارك

عبدالرحمن بن يزيد في الزرع و عامل عمر الناس على ان جاء عمر بالبذر من عنده فله الشطر و ان جاؤا بالبذر فلهم كذا و قال الحسن لا باس ان تكون الارض لاحدهما فينفقان جميعا فما خرج فهو بينهما و رای ذالک الزهری و قال الحسن لا باس ان يجتنى القطن على النصف و قال ابراهيم و ابن سيرين و عطاء و الحكم والزهری و قتادہ لا باس ان يعطى الثوب بالثلث او الربع و نحوه قال معمر لا باس ان تكرى الماشية على الثلث والربع الى اجل مسمى.

باب: مزارعت نصف پر بھی ہوسکتی ہے اور اس سے زیادہ اور کم پر بھی ہوسکتی ہے

قیس بن مسلم، ابوجعفر سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ میں کوئی مہاجر خاندان ایسا نہیں تھا جو پیداوار کے ثلث پر یا چوتھائی پر زراعت نہ کرتے ہوں۔ حضرت علیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، حضرت ابوبکرؓ کے خاندان والے، حضرت عمرؓ کے خاندان والے، حضرت علیؓ کے خاندان والے اور ابن سیرین سب بٹائی کیا کرتے۔ اور عبدالرحمٰن بن اسود کہتے ہیں کہ میں کھیتی میں عبدالرحمٰن بن یزید کا شریک رہتا۔ اور حضرت عمرؓ نے لوگوں سے اس شرط پر معاملہ کیا کہ اگر عمرؓ بیج دیں گے تو نصف ان کا حصہ ہوگا اور اگر بیج لوگوں کا ہو تو وہ اتنا حصہ لیں۔ اور حسن نے کہا کہ زمین اگر دو میں سے کسی ایک کی ہو اور وہ دونوں مل کر خرچ کریں اور زمین میں سے جو کچھ نکلے وہ آپس میں تقسیم کرلیں اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہی رائے زہری کی ہے۔ اور حسن نے کہا کہ اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ کپاس نصف پر چنوائی جائے۔ ابراہیم، ابن سیرین، عطاء، حکم، زہری اور قتادہ نے کہا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے کہ جولاہے کو کپڑے میں تہائی یا چوتھائی کا شریک کرلیں۔ اور معمر نے کہا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں کہ ایک جانور ثلث یا ربع پر ایک معین مدت تک دے دیا جائے۔

وضاحت:۔ امام بخاری نے اتنا بڑا باب باندھا ہے اور اس میں ساری معلومات جمع کردی ہیں کہ بٹائی نصف پر، ربع پر، تہائی پر غرض کہ طے شدہ حصہ پر ہوسکتی ہے۔ مزارعت کے حق میں سارے فتوے جمع کر دیئے ہیں۔ لوگ مزارعت کے خلاف امام ابوحنیفہ کے فتویٰ کا حوالہ دیتے ہیں۔ مجھے امام صاحب سے بڑا حسن ظن ہے۔ ان تمام اکابرین کے عمل کے ہوتے ہوئے وہ ایسی فضول بات کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مزارعت

ناجائز ہے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور ان کے خاندان والوں نے، سب نے مزارعت کی ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے معاملہ کیا کہ اگر وہ بیج دیں گے تو ان کا نصف حصہ ہوگا اور دوسرا بیج دے گا تو حصہ کچھ اور ہوگا۔ یہ بات تسلیم کرنا ممکن نہیں کہ یہ سب لوگ شریعت سے نابلد تھے یا محض اپنے فائدے کے لیے ایک ناجائز کام کرتے رہے۔

جولاہے کے بارے میں جو ذکر ہے کہ تہائی یا چوتھائی پر اس سے معاملہ ہوسکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روئی کی کچھ مقدار دے کر اس کا تہائی یا چوتھائی کپڑا لے لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کاتنے اور بننے کا لحاظ کیا جائے گا۔ اور جو جانور ثلث یا ربع پر ایک معین مدت کے لیے دیا جاتا تھا تو یہ ہوسکتا ہے کہ کھیت میں ہل چلانے کے لیے دیا جاتا ہو اور ایک معین مدت کے لیے ایک معین حصہ اس کے عوض لے لیا جاتا ہو۔

❁ حدثنا ابراهيم بن المنذر حدثنا انس بن عياض عن عبيدالله عن نافع عن عبدالله بن عمرؓ اخبره عن النبي ﷺ عامل خيبر بشطر ما يخرج منها من ثمر او زرع فكان يعطى ازواجه مائة وسق ثمانون وسق تمر و عشرون وسق شعير فقسم عمرؓ خيبر فخير ازواج النبي ﷺ ان يقطع لهن من الماء والارض او يمضى لهن فمنهن من اختار الارض و منهن من اختار الوسق و كانت عائشة اختارت الارض.

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کا معاملہ نصف پیداوار پر کیا تھا۔ جو اس سے پیدا ہو خواہ وہ کھجور ہو یا غلہ۔ تو آنحضرت ﷺ اپنی ازواج کو اس میں سے سو وسق دیتے تھے، اسی وسق کھجور کے اور بیس وسق جو کے۔ جب حضرت عمرؓ نے خیبر کو تقسیم کرایا تو ازواج النبی ﷺ کو اختیار دے دیا کہ یا تو ان کے لیے زمین اور پانی متعین کر دیا جائے یا جو راشن ان کو ملتا رہا ہے وہ ملتا رہے۔ تو ان میں سے بعض نے زمین کا انتخاب کیا اور بعض نے پیداوار کا۔ حضرت عائشہؓ نے زمین کا انتخاب کیا۔

وضاحت:۔ آنحضرت ﷺ نے خیبر کی زمین نصف پیداوار کی بٹائی پر یہود کو دی تھی۔ اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہا تھا کہ جب تک ہم چاہیں تم یہ کام کرو گے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں یہود کو بے دخل کر دیا اور زمین تقسیم کر دی۔ آپ نے ازواج النبی ﷺ کو اختیار دیا کہ جو راشن آنحضرت

ﷺ نے ان کے لیے مقرر کیا تھا چاہیں تو وہ لیں یا چاہیں تو زمین لیں۔ حضرت عائشہؓ نے زمین لینا پسند کیا۔

باب: اذا لم یشترط السنین فی المزارعة

باب: جب کوئی شخص اپنی زمین سالوں کی قید لگائے بغیر مزارعت پر دے دے

۞ حدثنا مسدد حدثنا یحیی بن سعید عن عبیداللہ حدثنی نافع عن ابن عمرؓ قال عامل النبی ﷺ خیبر بشطر ما یخرج منھا من ثمر او زرع.

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کی بٹائی نصف پر کر لی، خواہ اناج ہو یا میوہ۔

وضاحت:۔ اس روایت میں یہ ذکر نہیں ہے کہ کتنے دنوں کے لیے، لیکن دوسری روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ جب تک ہم چاہیں گے یہ انتظام رکھیں گے اور جب چاہیں گے تم کو الگ کر دیں گے۔ تو یہ بھی شرط ہوئی۔ خیبر کی بٹائی کا معاملہ نصف پیداوار پر ہوا تھا۔ کیونکہ یہود نے درخواست کی تھی کہ آخر آپ زمین کا کوئی انتظام تو کریں گے تو ہمیں کام کرنے دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ شرط کے ساتھ زمین ان کے حوالہ کر دی۔ لہٰذا امام صاحب کا باب اس معاملہ میں مجروح ہے۔

اس میں زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب چاہیں مزارع کو زمین سے بے دخل کر دیں لیکن اس کی صورت بھی یہ نہیں ہو کہ فصل ابھی بیچ میں ہے، تیار ہونے میں کچھ وقت ہے اور آپ نے مزارع کو الگ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھیتی جو کھیت میں موجود ہے مزارع اس میں شریک ہے، وہ ایک حصہ کا مالک ہے۔ اس وجہ سے نکالنے کا وقت فصل پوری ہونے کے بعد مقرر ہوگا ورنہ ناانصافی ہوگی۔

باب:

۞ حدثنا علی بن عبداللہ حدثنا سفیان قال عمرو قلت لطاؤس لو ترکت المخابرة فانھم یزعمون ان النبی ﷺ نھیٰ عنہ قال ای عمرو انی اعطیھم و اعینھم و ان اعلمھم اخبرنی یعنی ابن عباسؓ ان النبی ﷺ لم ینہ عنہ ولکن قال ان یمنح احدکم اخاہ خیرلہ من ان یاخذ علیہ خرجا معلوما.

ترجمہ:۔ عمرو کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس سے کہا کہ مزارعت کا طریقہ آپ لوگ چھوڑ دیتے تو بہت اچھا تھا۔ اس لیے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ نبی ﷺ نے اس سے روکا ہے۔ طاؤس نے جواب دیا اے عمرو، میں

لوگوں کو زمین دیتا ہوں اور ان کو فائدہ پہنچاتا ہوں۔ اور لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے یعنی ابن عباسؓ نے مجھے خبر دی ہے کہ نبی ﷺ نے اس چیز سے روکا نہیں تھا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ یہ بات کہ ایک شخص زمین اپنے بھائی کو مفت دے دے بہتر ہے اس بات سے کہ اس پر متعین محصول لے۔

وضاحت:۔ معلوم ہوا کہ عمرو کی رائے بھی کمزور رہی ہے اور وہ احتیاط کے طور پر کہتے ہیں کہ مزارعت نہ کی جائے۔ اس لیے کہ لوگ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ طاؤس نے حضرت ابن عباسؓ کا حوالہ دیا کہ انہوں نے بتایا ہے کہ نبی ﷺ نے مزارعت سے روکا نہیں ہے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ کسی کے پاس زمین ہے تو بہتر ہے کہ اپنے بھائی کو یوں ہی مفت کاشت کے لیے دے دے۔ یعنی یہ فضیلت اور احسان کا طریقہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی کے گھر میں کوئی کمرہ خالی ہو تو کسی اپنے بھائی کو مفت رہنے کے لیے دے دے۔ اس کے معنی یہ تو نہیں کہ مکان کا کرایہ ہی ختم ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان معاملات کو خوب سمجھا ہے۔ اس روایت سے قضیہ کی وضاحت ہوگئی۔

باب: المزارعة مع الیھود

باب: یہود کے ساتھ مزارعت

۞ حدثنا ابن مقاتل اخبرنا عبداللہ اخبرنا عبیداللہ عن نافع عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ ﷺ اعطیٰ خیبر الیھود علی ان یعملوھا و یزرعوھا و لھم شطر ما خرج منھا.

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر یہودیوں کو دیا اس شرط پر کہ وہ وہاں محنت کریں اور کھیتی کریں۔ جو پیداوار ہوگی اس کا آدھا ان کا ہوگا۔

وضاحت:۔ امام صاحب نے باب باندھا ہے کہ یہود کے ساتھ مزارعت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہ ایک غیر ضروری سی بات ہے۔ مزارعت سب کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔

باب: مایکرہ من الشروط فی المزارعة

باب: وہ شرطیں جو مزارعت میں مکروہ ہیں

۞ حدثنا صدقة بن الفضل اخبرنا ابن عیینة عن یحییٰ سمع حنظلة الزرقی عن رافع قال کنا اکثر اھل المدینة حقلا و کان احدنا یکری ارضہ فیقول ھذہ القطعة

لی و هذه لک فربما اخرجت ذه و لم تخرج ذه فنهاهم النبی ﷺ.

ترجمہ:۔ رافع کہتے ہیں کہ ہم مدینہ میں سب سے بڑے کھیتی کرنے والے تھے۔ ہم میں کوئی اس شرط پر زمین دیتا تھا کہ زمین کا یہ قطعہ میرے لیے اور یہ قطعہ تمہارے لیے ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا کہ یہ قطعہ پیداوار دیتا اور وہ قطعہ پیداوار نہ دیتا تو نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

وضاحت:۔ اس روایت میں جس چیز سے روکا ہے اس کی شرح ہو چکی ہے۔ یعنی معاملہ کی یہ شکل مختلف ہے کہ رقبہ کا ایک حصہ آپ مخصوص کر لیں کہ اس کی پیداوار آپ کی ہوگی اور دوسرا مخصوص حصہ مزارع کو دیں کہ اس کی پیداوار وہ لے گا۔ اس میں ضرر وغرر ہے اور اصول کے لحاظ سے ممنوع ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک حصہ میں فصل ہو دوسرا کچھ نہ دے یا اس کا الٹ ہو جائے۔ اس لیے اس سے منع فرمایا ہے۔ فربما اخرجت ذه ولم تخرج ذه ، یہ ٹھیٹ عربی ہے جو صرف حدیثوں میں ہی ہے۔ قرآن مجید کی زبان گو کہ سب سے اعلیٰ ہے لیکن اس میں اس طرح کے مباحث نہیں ہیں۔

باب: اذا زرع بمال قوم بغير اذنهم و كان في ذالك صلاح لهم

باب: کوئی آدمی کسی کے مال کو بغیر اس کی اجازت کے کھیتی میں لگا دے اور اس میں اس کی فلاح ہو تو جائز ہے۔

❁ حدثنا ابراهيم بن المنذر حدثنا ابو ضمرة حدثنا موسى بن عقبة عن نافع عن عبدالله بن عمرؓ عن النبی ﷺ قال بينما ثلاثة نفر يمشون اخذهم المطر فاووا الى غار فى جبل فانحطت على فم غارهم صخرة من الجبل فانطبقت عليهم فقال بعضهم لبعض انظروا اعمالا عملتموها صالحة لله فادعوا الله بها لعله يفرجها عنكم قال احدهم اللهم انه كان لى والدان شيخان كبيران ولى صبية صغار كنت ارعى اليهم فاذا رحت عليهم حلبت فبدأت بوالدى اسقيهما قبل بنى و انى استاخرت ذات يوم فلم ات حتى امسيت فوجدتهما ناما فحلبت كما كنت احلب فقمت عند رؤسهما اكره ان او قظهما و اكره ان اسقى الصبية والصبية يتضاغون

عند قدمى حتى طلع الفجر فان كنت تعلم انى فعلته ابتغاء وجهک فافرج لنا فرجة نرى منها السماء ففرج الله فرأوا السماء و قال الاخر اللهم انها كانت لى بنت عم احببتها كاشد ما يحب الرجال النساء فطلبت منها فابت حتى اتيتها بمائة دينار فبغيت حتى جمعتها فلما وقعت بين رجليها قالت يا عبدالله اتق الله ولا تفتح الخاتم الا بحقه فقمت فان كنت تعلم انى فعلته ابتغاء وجهک فافرج عنا فرجة ففرج و قال الثالث اللهم انى استاجرت اجيرا بفرق ارز فلما قضى عمله قال اعطنى حقى فعرضت عليه فرغب عنه فلم ازل ازرعه حتى جمعت منه بقرا و رعاتها فجاء نى فقال اتق الله فقلت انطلق الى ذالک البقر و رعاتها فخذ فقال اتق الله ولا تستهزئ بى فقلت انى لا استهزئ بک فخذ فاخذه فان كنت تعلم انى فعلت ذالک ابتغاء وجهک فافرج ما بقى ففرج الله قال ابو عبدالله و قال ابن عقبة عن نافع فسعيت.

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تین آدمی سفر میں جا رہے تھے کہ انہیں بارش نے آلیا۔ تو انہوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ غار کے منہ پر پہاڑ کے اوپر سے ایک چٹان آ گری جس سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ اپنے اپنے اعمال کا شمار کرو کہ کس نے کیا کیا نیک عمل اللہ کی راہ میں کیے ہیں اور اس کے واسطے سے اللہ سے دعا کرو تاکہ وہ تم کو اس مصیبت سے نکالے۔ ایک نے کہا کہ اے اللہ میرے والدین دونوں بوڑھے تھے اور میرے بچے چھوٹے تھے۔ میں ان کے لیے بکریاں چراتا تھا۔ جب میں لوٹتا تو دودھ دوہتا اور اپنے والدین سے دودھ کا پلانا شروع کرتا۔ ایک دن مجھے دیر ہوگئی اور رات تک گھر نہ آیا۔ آیا تو دیکھا کہ میرے والدین سو گئے ہیں۔ میں نے دودھ نچوڑا جیسا کہ میں نچوڑتا تھا۔ اور دودھ لیے ہوئے ان کے سرہانے کھڑا ہوا لیکن جگانا پسند نہ کیا۔ بچے میرے پاؤں کے پاس بلبلا رہے تھے لیکن ان سے پہلے بچوں کو پلانا مناسب نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ اسی حال میں فجر ہوگئی۔ اے رب تو جانتا ہے کہ اگر میں نے یہ تیری رضا کے لیے کیا تو ہمارے لیے غار کا دہانہ کھول دے کہ ہمیں آسمان نظر آئے تو اللہ نے دہانہ کھول دیا جس سے انہوں نے آسمان دیکھا۔ دوسرے نے کہا کہ اے اللہ میری ایک چچا زاد بہن تھی، میں اس سے سخت محبت کرتا تھا جیسی کہ ایک مرد ایک عورت سے کر

سکتا ہے۔ میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے انکار کیا اور شرط لگائی کہ ایک سو دینار دو تب۔ تو میں نے اس کی کوشش کی یہاں تک کہ سو دینار جمع کر لیے تو جب میں نے اس سے مقصد پورا کرنا چاہا تو اس نے کہا اے اللہ کے بندے! اللہ سے ڈر اور مہر کو حق کے بغیر نہ توڑ۔ تو میں اٹھ گیا۔ تو جانتا ہے کہ میں نے یہ تیری رضا کے لیے کیا ہے۔ تو ہماری یہ بلا ٹال دے تو دہانہ کچھ اور کھل گیا۔ تیسرے نے کہا، اے اللہ میں نے ایک مزدور ایک ٹوکرا چاول کے اوپر رکھا۔ جب اس نے کام پورا کر لیا تو اس نے کہا کہ میرا حق دو۔ میں نے چاول اس کے سامنے پیش کر دیے تو اس نے بے رغبتی کی۔ میں اس چاول کو کھیت میں بوتا رہا یہاں تک کہ میں نے اس سے گائیں خریدیں اور چرواہے بھی رکھ لیے۔ تو وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ اللہ سے ڈر اور میرا جو حق ہے وہ واپس کر۔ تو میں نے کہا جاؤ وہ گائیں اور چرواہے سب تمہارے ہیں لے لو۔ اس نے کہا اللہ سے ڈرو اور میرے ساتھ مذاق نہ کرو۔ میں نے کہا میں مذاق نہیں کر رہا۔ یہ سب تمہارے ہیں لے لو تو وہ لے گیا۔ اے رب اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ تیری رضا کے لیے کیا ہے تو اب کسر پوری کر دے تو اللہ نے پتھر ہٹا دیا۔

وضاحت:۔ یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں بتا چکا ہوں کہ یہ اسرائیلی قصوں میں سے ہے۔ اسرائیلیات میں سے جتنے قصے آنحضرت ﷺ نے بیان کیے وہ بہرحال سبق آموزی کے لیے بیان کیے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک اس قصہ کا تعلق ہے یہ اسلام کے مزاج سے موافقت نہیں رکھتا اس لیے کہ اسلام میں یہ بات بہرحال پسندیدہ نہیں ہے کہ آپ اپنی نیکی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگیں۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے رحم، اس کے کرم، اس کی فیاضی اور جود کے حوالے سے مانگنا چاہیے۔ مجھے کوئی روایت اس کے حق میں ملی اور نہ قرآن میں ایسا کوئی اشارہ ہے کہ آدمی اپنے نیک اعمال کے حوالے سے اللہ سے کچھ مانگے۔ ایک روایت کسی کو واسطہ بنانے کی ملتی ہے اور وہ میرے نزدیک شیعہ حضرات کی گھڑی ہوئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے حوالے سے پانی کی دعا کی تھی۔ وہ بھی اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ روایت اصولوں کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی شخص امانت میں تصرف کرے اور نقصان ہو جائے تو اس صورت میں تاوان دینا پڑے گا۔ آپ اگر نفع کی واحد شرط پر زیادہ سے زیادہ دینا چاہتے ہیں تو ضرور دیجئے۔ لیکن فقہی اور اخلاقی حیثیت سے مذکورہ

اعتراض باقی رہتا ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ۔

باب: اوقاف اصحاب النبی ﷺ و ارض الخراج و مزارعتهم و معاملتهم

و قال النبی ﷺ لعمر تصدق باصله لا يباع و لكن ينفق ثمره فتصدق به

باب: صحابہؓ کے اوقاف اور خراجی زمین اور اس کی بٹائی کے معاملات۔

اور نبی کریم ﷺ نے عمرؓ سے فرمایا اصل زمین کو صدقہ کرنا، اس کی بیع نہ ہو البتہ اس کا حاصل خرچ کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے صدقہ کیا۔

وضاحت:۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا کوئی زمین کا معاملہ تھا۔ تو آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ زمین کو تقسیم کرنے کی بجائے وقف کر دو۔ اس کی آمدنی تقسیم ہوتی رہے گی یعنی اصل مال محفوظ رہے گا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق اس روایت کو امام صاحب نے باب میں بطور تعلیق لیا ہے۔

۞ حدثنا صدقة اخبرنا عبدالرحمن عن مالک عن زيد بن اسلم عن ابيه قال قال عمرؓ لو لا اخر المسلمين ما فتحت قرية الا قسمتها بين اهلها كما قسم النبی ﷺ خيبر.

ترجمہ:۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے بعد کے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو کوئی بستی میری حکومت میں فتح نہ ہوتی مگر یہ کہ میں اس کو اس کے حق داروں میں تقسیم کر دیتا۔ جس طرح آنحضرت ﷺ نے خیبر کے معاملہ میں کیا۔

وضاحت:۔ خیبر کے معاملہ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں زمین حق داروں میں تقسیم کر دی گئی اور حضرت عائشہؓ نے حصہ مانگا تو ان کا حصہ دے دیا گیا۔ جب عراق اور ایران وغیرہ کی زمینیں فتح ہوئیں تو سمجھ لیجئے کہ دنیا کی بہترین زمینوں کا بہت بڑا علاقہ تصرف میں آ گیا۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ زمینیں مسلمانوں پر وقف ہیں یعنی ذاتی ملکیت نہیں ہوگی بلکہ اجتماعی ملکیت ہوگی اس لیے کہ آج ان لوگوں میں زمینیں بانٹ دیں تو بعد میں جو لوگ آئیں گے وہ کہاں جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ اپنی زمین وقف کر دو اور اس کی پیداوار صدقہ کرو۔

ورنہ حضور کے دور میں اس پر عمل نہیں رہا اور غزوہ خیبر تک کی تمام مفتوحہ زمینیں تقسیم کر دی گئیں۔ امام بخاری نے تعلیق نقل کر کے اس اعتراض کا جواب دے دیا ہے کہ جو کام آنحضرت ﷺ نے نہیں کیا تھا تو حضرت عمرؓ کو کیا حق تھا کہ وہ زمینوں کو اس طریقہ سے وقف کر دیتے۔ آخر غازی لوگ مطالبہ کر سکتے تھے لیکن تاریخوں میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ لوگوں نے کبھی احتجاج کیا ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کے حق میں اس مصلحت دینی کا حوالہ دیا کہ انہیں بعد کے مسلمانوں کا خیال ہے اور یہ علت بہت اہم ہے۔ اب آپ خود نتائج اخذ کر سکتے ہیں کہ زمینوں کے معاملہ میں کیا کیا تصرف اسلامی قانون کی رو سے جائز ہے۔

باب: من احیاء ارضا مواتا ورای ذالک علی رضی اللہ عنہ فی ارض الخراب بالکوفۃ و قال عمرؓ من احیا ارضا میتۃ فھی لہ و یروی عن عمرؓ و بن عوف عن النبی ﷺ و قال فی غیر حق مسلم و لیس لعرق ظالم فیہ حق و یروی فیہ عن جابرؓ عن النبی ﷺ.

باب: کسی مردہ زمین کو زندہ کرنے والے کے لیے حکم۔ حضرت علیؓ نے کوفہ کی ویران زمینوں کے بارے میں یہی رائے دی۔ اور حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ جس کسی نے غیر آباد زمین کو آباد کیا وہی اس کا حق دار ہے۔ اور عمرؓ اور ابن عوفؓ دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ وہ لے سکتا ہے بشرطیکہ زمین کسی مسلمان کی ملکیت نہ ہو۔ کوئی شخص ظلم کر کے کسی زمین پر قبضہ کرے تو وہ اس کا حق دار نہیں ہوتا۔ اور جابرؓ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

❁ حدثنا یحیی بن بکیر حدثنا اللیث عن عبیداللہ بن ابی جعفر عن محمد بن عبدالرحمن عن عروۃ عن عائشۃؓ عن النبی ﷺ قال من اعمر ارضا لیست لاحد فھوا حق قال عروۃ قضیٰ بہ عمرؓ فی خلافتہ.

ترجمہ:۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ایسی غیر آباد زمین کو آباد کرے جو کسی کی ملک نہ ہو تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ عروہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں یہی فیصلہ کیا۔

وضاحت:۔ کسی غیر آباد زمین کو آباد کیا یعنی اس کو کھیتی باڑی کے لیے تیار کیا یا باغ لگایا یا کسی کارخانے اور

ل کے لیے استعمال کیا یا مکان تعمیر کروا لیے۔ غرض یہ سب کام اس میں داخل ہیں۔ علی ھذا القیاس مویشیوں کے لیے چراگاہیں بھی اس میں بنائی جا سکتی ہیں۔ آباد کا لفظ یہاں غیر آباد کے مقابل میں آیا ہے۔

یہ مسئلہ البتہ قابل غور ہے کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا کسی کو مطلق حق ہے کہ جو چاہے اٹھے اور جس زمین کے بارے میں گمان ہو کہ غیر آباد ہے تو اس کو آباد کر لے۔ اس معاملہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ دوسرے فقہاء تو یہ آزادی تسلیم کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ کہتے ہیں کہ حکومت کی اجازت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مطلق آزادی سے بڑی افراتفری ہو سکتی ہے۔ اس زمانے میں زمین یا تو زمینداروں کی ہے یا حکومت کی ہے۔ اس وقت جب کہ یہ شکل نہیں تھی کسی نے زمین آباد کر دی تو حکومت اس کو دے دیتی تھی کیونکہ وہ محنت کر کے اس کو آباد کر لیتا تھا۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو۔ کسی اور نے زمین پر پہلے قبضہ کیا تھا لیکن آباد نہیں کر پایا تو حکومت اگر چاہے تو اجازت دے دے گی ورنہ زمین اس سے واپس لے سکتی ہے۔ بلاشبہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ بات نکلتی ہے کہ زمین آباد کرنے والے کا حق زیادہ ہے لیکن اس بارے میں کوئی نزاع ہو تو حکومت ہی فیصلہ کرے گی۔ اس میں قوی مسلک احناف ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ شوافع جو بات کہتے ہیں وہ مصالح اور قانون کے خلاف ہے۔

روایت میں حوالہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہی طرز عمل اختیار کیا تھا کہ آباد کرنے والے کو زمین دے دیتے تھے۔ اب ہمارے دور میں حکومت آبادکاری کا منصوبہ بنا سکتی ہے اور یہ اعلان کر سکتی ہے کہ تین سال کی مدت کے اندر جو زمین آباد کرے وہ اس کی ہے۔ تین سال کی مدت حالات کے لحاظ سے ہوگی۔ اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور اس کو حصر کے مفہوم میں نہیں لینا چاہیے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

درس موطا امام مالکؒ

(باب جامع الوضوء کی روایات)

وَ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِکٍ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمَانِ عَنْ اَبِیهِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ اِلَی الْمَقْبَرَةِ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ. دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِینَ. وَ اِنَّا. اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَاحِقُونَ. وَدِدْتُ اَنِّی قَدْ رَاَیْتُ اِخْوَانَنَا فَقَالُوْا: یَا رَسُولَ اللّٰهِ! اَلَسْنَا اِخْوَانَکَ؟ قَالَ: بَلْ اَنْتُمْ اَصْحَابِی وَ اِخْوَانُنَا الَّذِینَ لَمْ یَاْتُوا بَعْدُ وَاَنَا فَرَطُهُمْ عَلَی الْحَوْضِ. فَقَالُوا یَا رَسُولَ اللّٰهِ! کَیْفَ تَعْرِفُ مَنْ یَاْتِی. بَعْدَکَ مِنْ اُمَّتِکَ؟ قَالَ اَرَاَیْتَ لَوْ کَانَ لِرَجُلٍ خَیْلٌ غُرٌّ مُحَجَّلَةٌ" فِی خَیْلٍ دُهْمٍ بُهْمٍ اَلَا یَعْرِفُ خَیْلَهُ"؟ قَالُوا: بَلَی یَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ فَاِنَّهُمْ یَاْتُونَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِینَ مِنَ الْوُضُوءِ. وَ اَنَا فَرَطُهُمْ. عَلَی الْحَوْضِ. فَلَا یُذَادَنَّ رِجَالٌ" عَنْ حَوْضِی کَمَا یُذَادُ الْبَعِیرُ الضَّالُّ اُنَادِیهِمْ: اَلَا هَلُمَّ اَلَا هَلُمَّ! اَلَا هَلُمَّ! فَیُقَالُ: اِنَّهُمْ قَدْ بَدَّلُوا بَعْدَکَ. فَاَقُولُ: فَسُحْقًا! فَسُحْقًا! فَسُحْقًا!

ترجمہ:۔ .... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن قبرستان کی طرف چلے گئے اور (قبرستان میں) یہ فرمایا: السلام علیکم! اے مسلمانوں کی بستی! اور ہم۔ ان شاء اللہ۔ تم سے مل کر رہیں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کاش! میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا۔ تو لوگوں نے سوال کیا: یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ بھائی نہیں بلکہ میرے ساتھی ہو! اور میرے بھائی وہ لوگ ہیں جو ابھی نہیں آئے ہیں۔ اور میں حوض (کوثر) پر ان کا پیش رو ہوں گا! لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ ان لوگوں کو کیسے پہچانیں گے جو آپ کی امت میں سے بعد میں آئیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ بھلا بتاؤ کہ اگر کسی شخص کے پنج کلیان گھوڑے ہوں اور وہ سیاہ یک رنگ گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ اپنے گھوڑے پہچان نہیں لے گا؟ تو انہوں نے کہا ہاں! یا رسول اللہ (ضرور پہچان لے گا) آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے سبب سے تاباں پیشانی اور چمکتے پاؤں کے ساتھ آئیں گے۔ اور میں حوض (کوثر) پر ان کا پیش رو ہوں گا۔ پس ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ میرے حوض سے دھتکارے جائیں جس طریقہ سے کہ بھٹکا ہوا اونٹ دھتکارا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں ان کو پکاروں کہ آؤ!

آؤ! آؤ! اور مجھے بتایا جائے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے بعد دین کو بدل ڈالا۔ تو پھر مجھے کہنا پڑے کہ دفع ہوں! دفع ہوں! دفع ہوں!۔

وضاحت:۔ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِینَ: یہاں ہم حرف ندا یعنی 'یا' کو محذوف مان سکتے ہیں۔ اور میرے نزدیک یہی قابل ترجیح ہے۔ ایک فعل محذوف مان کر تخصیص کے معنی لینا محض ایک تکلف ہے۔

وَ اِنَّا ـــ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ ـ بِکُمْ لَاحِقُونَ: اور ہم۔ ان شاء اللہ۔ تم سے مل کر رہیں گے۔ یہ کلمہ موت کا تذکیر ہے۔ آدمی مسلمانوں کے قبرستان میں جائے تو یہ مکمل دعا ضرور پڑھنی چاہیے۔ وہاں اسی یاددہانی کے لیے جانا چاہیے کہ ہمیں بھی یہاں ایک دن آنا ہے۔ اس دعا کے اسلوب میں اشتیاق کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ مارے باندھے ہم بھی یہاں آئیں گے۔ بلکہ اس کے اندر مدعا یہ ہے کہ ہم بھی اس کی تمنا رکھتے ہیں کہ ایک دن یہاں آئیں گے۔ اِنّا قطعیت کو ظاہر کرتا ہے۔

وَدِدْتُ اَنِّی قَدْ رَاَیْتُ اِخْوَانَنَا: کاش! میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا۔ یہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تمنا کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ دعا کا حصہ نہیں ہے۔ یعنی بعد والے مسلمانوں کو دیکھ سکتا جو ہماری طرح جئیں گے، مریں گے اور ہماری طرح دفن ہو کر بالآخر ہم سے مل جائیں گے اور اس ملت کے افراد ہوں گے۔

فَرَط": اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی قافلے کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ڈول، پانی وغیرہ کا انتظام کر رکھتا ہے۔

اَلْحَوْض: سے مراد ظاہر ہے حوض کوثر ہے کہ جس پر سب لوگ جمع ہوں گے اور جس کا مجاز اور مشابہ اس دنیا میں خانہ کعبہ ہے۔ یہی وہاں حوض کوثر کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔

غُرّ": جمع ہے غُرّۃ کی۔ جس کی پیشانی چمکتی ہوئی سفید ہو۔

مُحَجَّلَة": وہ گھوڑے جن کے پاؤں سفید ہوں۔

دُهْم": ادھم کی جمع یعنی سیاہ رنگ کا۔

جب صحابہ کرامؓ نے عرض کی کہ ہم کو تو آپ جانتے ہیں لیکن بعد میں آنے والوں کو آپ قیامت کے روز کیسے پہچانیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے سبب سے پہچانے جائیں گے۔ یعنی چونکہ دنیا میں وضو کرتے رہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ ان کی پیشانی بھی تاباں ہوگی اور ان کے ہاتھ پاؤں بھی روشن ہوں گے۔ ان کو پہچاننا اسی طرح آسان ہوگا جس طرح سیاہ رنگ کے گھوڑوں میں پنج کلیان گھوڑوں کا امتیاز کرنا آسان ہوتا ہے۔ میں حوض کوثر پر ان کا پیش رو اور منتظر ہوں گا۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ قیامت کے روز کچھ لوگ میرے امتیوں میں ایسے بھی شامل ہو جائیں گے جو حوض پر پہنچنے کے مستحق نہیں ہوں گے تو ان کو حوض سے

اس طرح ہٹا دیا جائے گا جیسے حوض کا کوئی مالک کسی بھٹکے ہوئے اونٹ کو اپنے حوض سے بھگا دیتا ہے۔ یہ لوگ منافقین ہوں گے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ سچے مسلمان اپنے ایمان کی روشنی میں چلیں گے۔ منافقین بھی ان کے ساتھ چلنا شروع کر دیں گے اور ان سے کہیں گے کہ اپنی روشنی میں سے ہمیں بھی کچھ حصہ دو۔ تو حکم ہوگا کہ:

قِيلَ ارْجِعُوا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا. (الحدید۔۵۷:۱۳)

﴿ان کو جواب ملے گا کہ تم پیچھے لوٹو اور وہاں روشنی تلاش کرو۔﴾

معلوم ہوتا ہے کہ حوض پر یہ غیر مستحق لوگ مومنین کے ساتھ ملے چلے پہنچیں گے تو آنحضرت ﷺ اپنی امت کی محبت میں ان کو بھی پکاریں گے کہ آؤ! آؤ! آؤ! لیکن آپ کو اطلاع دی جائے گی کہ یہ لوگ وہ نہیں ہیں کہ اس حوض کے حق دار ہوں بلکہ ان لوگوں نے آپ کے بعد دین کو اپنی بدعتوں سے بدل دیا اور گمراہیوں میں مبتلا ہوئے۔ اس پر حضور ﷺ بھی فرمائیں گے دفع ہوں! دفع ہوں! دفع ہوں!

باقی رہ گیا کہ حضور ﷺ کو اشتباہ کیوں پیش آئے گا؟ میرے نزدیک اشتباہ کی وجہ یہ ہے کہ جب پوری بھیڑ آئے گی تو کچھ لوگ اس قابل ہوں گے کہ آگے بڑھیں، دوسرے نکالے جانے کے لائق ہوں گے لیکن پوری بھیڑ کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ جب فرشتے غیر مستحق لوگوں کو روکیں گے تو آنحضرتؐ کو اشتباہ ہوگا کہ کچھ لوگ دھتکارے کیوں جا رہے ہیں؟ یہ تاویل اگرچہ میری ہے لیکن کمزور نہیں ہے۔ دین کا معاملہ نہایت حساس ہے۔ اس میں نازنخروں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے حضور ایسے لوگوں کو چھڑانے کے لیے امتی امتی نہیں کہیں گے۔ بلکہ فرشتوں کی رپورٹ مل جانے کے بعد کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد آپ کے دین کو بگاڑا حضور بڑی صفائی کے ساتھ فرما دیں گے کہ تب یہ دور ہوں، دور ہوں۔

۳۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ. أَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ جَلَسَ عَلَى الْمَقَاعِدِ. فَجَاءَ الْمُؤَذِّنُ فَآذَنَهُ بِصَلَاةِ الْعَصْرِ. فَدَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ. ثُمَّ قَالَ: وَاللَّهِ! لَأُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيثًا لَوْ لَا أَنَّهُ فِي كِتَابِ اللَّهِ مَا حَدَّثْتُكُمُوهُ. ثُمَّ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَا مِنْ امْرِئٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوءَهُ ثُمَّ يُصَلِّي الصَّلَاةَ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الصَّلَاةِ الْأُخْرَى حَتَّى يُصَلِّيَهَا.

قَالَ يَحْيَى: قَالَ مَالِكٌ: أُرَاهُ يُرِيدُ هَذِهِ الْآيَةَ. أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَالِكَ ذِكْرَى لِلذَّاكِرِينَ.

ترجمہ:۔ ......حمران سے، جو حضرت عثمان بن عفانؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں، روایت ہے کہ حضرت

عثمانؓ اپنے مکان کے سامنے چبوتروں پر بیٹھے تھے کہ موذن آیا اور اس نے آپ کو عصر کی نماز کی اطلاع کی۔ آپ نے پانی منگوایا اور وضو کیا۔ پھر فرمایا خدا کی قسم! میں تم سے ایک حدیث بیان کروں گا اور اگر اللہ کی کتاب میں وہ بات نہ ہوتی تو میں تم سے بیان نہ کرتا۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو وضو کرے تو اچھی طرح وضو کرے، پھر نماز پڑھے کہ اس کے وہ گناہ جو اس نماز کے اور دوسری نماز کے درمیان ہیں بخش نہ دیے جاتے ہوں، یہاں تک کہ وہ نماز پڑھ لے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ مالکؒ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ کا اشارہ اس آیت کی طرف تھا۔

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ. إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِينَ. (ھود۔۱۱:۱۱۴)

﴿اور نماز کا اہتمام کرو دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔﴾

وضاحت:۔ حضرت عثمانؓ کے مکان کے سامنے کچھ چبوترے بنے ہوئے تھے جن پر ملنے کے لیے آنے والے لوگ بیٹھتے رہے ہوں گے۔ اس عہد میں باقاعدہ میٹنگ روم اور ریسٹ ہاؤس تو نہیں ہوا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنے اصحاب معاملہ آتے رہے ہوں گے جو ان چبوتروں پر بیٹھ کر اپنا مدعا بیان کرتے اور حضرت عثمانؓ سنا کرتے۔

وَاللَّهِ! لَأُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيثًا لَوْ لَا أَنَّهُ فِي كِتَابِ اللَّهِ مَا حَدَّثْتُكُمُوهُ کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث میں بیان کروں گا وہ چونکہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اس لیے بیان کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر ﷺ کی بات ہوگی تب تو اس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ قرآن مجید سے یا وحی الٰہی سے ماخوذ ہوگی لیکن حضرت عثمان غنیؓ جب اپنی طرف سے بیان کرتے ہیں تو اسے قسم سے بھی موید کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے یہ حدیث نبی ﷺ سے سنی اور اس کو قسم کی بھی تائید حاصل ہے۔ گویا اس کا درجہ نقل و استنباط کے بعد قسم کی تائید سے اور اونچا ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عثمان غنیؓ روایت حدیث میں بہت احتیاط فرماتے تھے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی حدیث بیان کی جائے تو بس یونہی نہ بیان کر دی جائے بلکہ اس کی مضبوط اور محکم بنیاد ہونی چاہیے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے جو حدیث بیان کی وہ یہ تھی کہ جب ایک آدمی نماز کے لیے اچھی طرح وضو کرے، یعنی یہ نہیں کہ کچھ چھینٹے ادھر مارے کچھ ادھر مارے جس سے کبھی ایڑیاں خشک رہ گئیں اور کبھی

کھنیاں، بلکہ بڑے اہتمام سے وضو کرے، پھر نماز ادا کرے تو اس کے وہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں جو ایک نماز اور دوسری نماز کے درمیان اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس مضمون کی حامل اور بھی روایات ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ایک گناہ تو وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق اڑتی ہوئی گرد کے طریقہ سے صرف ظاہری اعمال سے ہوتا ہے۔ مثلاً کہیں آنکھ بھٹک گئی، کہیں زبان بہک گئی، کہیں پاؤں غلط راہ پر اٹھ گئے، کسی کی ہجو ہو گئی، تو ان تمام اعضاء کے گناہوں کو وضو کا پانی دھو دیتا ہے۔ اور یہاں وہی گناہ مراد ہیں جو کسی مومن سے دو نمازوں کے درمیان سرزد ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے گناہ وہ ہیں جن کے لیے انسان ارادہ کرتا ہے، جن میں قلب کا تعمد ہوتا ہے تو ایسے گناہ قلب کے گناہ ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق میرا خیال ہے کہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وضو کا پانی دل پر تو نہیں پہنچتا۔ وضو کا پانی جن اعضاء تک پہنچتا ہے تو ان کی گرد بے شک جھاڑ دیتا ہے۔ لیکن ارادہ کے گناہوں کے لیے دل کا غسل ناگزیر ہے۔ اس کے لیے توبہ کا پانی دل تک پہنچانا ہو گا۔ کوئی اور صورت کارگر نہیں ہو گی۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کا غسل اور دل کی پاکیزگی صرف اور صرف توبہ کے آنسوؤں سے ہوتی ہے۔ تو وہ تمام گناہ جن کا ارادہ قلب نے کیا ہے، جن میں اس نے نصرت کی ہے، جن میں وہ شریک ہے اور جن کو وہ اب تک عزیز جاں بنائے ہوئے ہے ان کی معافی کے لیے توبہ کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

میرے نزدیک حدیث میں اس طرح کے گناہوں کی بخشش کی خبر نہیں ہے۔ علی ہذا القیاس شرک و بدعت کے گناہوں کا معاف نہ ہونا خود قرآن کی نصوص سے ثابت ہے۔ پھر حقوق العباد کے گناہوں میں تو ایک تیسرا فریق بھی شامل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ایسے گناہوں کا فیصلہ متاثر فریق کو بیچ میں لائے بغیر نہیں فرمائے گا۔ لہٰذا ایسے گناہوں کو دھونے کے لیے وضو کا پانی کتنا ہی استعمال کیا جائے، یہ اس کی پہنچ سے باہر رہتے ہیں۔

۳۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِبْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ الصُّنَابِحِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُالْمُومِنُ فَتَمَضْمَضَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ فِيْهِ. وَ اِذَااسْتَنْثَرَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ اَنْفِهِ. فَاِذَا غَسَلَ وَجْهَهُ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ وَجْهِهِ. حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَشْفَارِ عَيْنَيْهِ. فَاِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ يَدَيْهِ. حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِ يَدَيْهِ. فَاِذَا مَسَحَ بِرَاْسِهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رَاْسِهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ اُذُنَيْهِ فَاِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رِجْلَيْهِ. حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ

اَظْفَارِ رِجْلَيْهِ. قَالَ: ثُمَّ كَانَ مَشْيُهُ اِلَى الْمَسْجِدِ وَ صَلَاتُهُ نَافِلَةً لَهُ.

ترجمہ:۔ عبداللہ صنابحی سے روایت ہے کہ جب بندۂ مومن وضو کرتا اور کلی کرتا ہے تو خطائیں اس کے منہ سے نکلتی ہیں۔ اور جب وہ ناک صاف کرتا ہے تو اس کے گناہ اس کی ناک سے نکلتے ہیں اور جب وہ اپنے منہ کو دھوتا ہے تو اس کے گناہ نکلتے ہیں اس کے چہرے سے، یہاں تک کہ وہ نکلتے ہیں اس کی آنکھوں کے پپوٹوں سے۔ پھر جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے گناہ اس کے ہاتھوں سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکلتے ہیں۔ پس جب وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کی خطائیں اس کے سر سے، یہاں تک کہ اس کے کانوں سے بھی خارج ہوتی ہیں۔ پھر جب وہ اپنے پاؤں دھوتا ہے تو اس کے گناہ اسکے دونوں پاؤں سے نکلتے ہیں، یہاں تک کہ وہ نکلتے ہیں اس کے دونوں پاؤں کے ناخنوں سے بھی۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا اس بندہ مومن کا مسجد کی طرف چلنا اور نماز ادا کرنا اس کے لیے مزید برآں ہوتا ہے۔

وضاحت:۔ اس روایت کے راوی۔ عبداللہ صنابحی۔ صحابی نہیں ہیں بلکہ تابعی ہیں۔ اس لیے اصطلاحی طور پر یہ روایت مرفوع کی بجائے مرسل ہوئی۔ لیکن امام مالکؒ کے مرسلات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے مرسلات کو محدثین مرفوعات ہی کے درجے میں رکھتے ہیں اس لیے کہ دوسرے لوگوں نے ان روایتوں کو مرفوع کر دیا ہے۔

(دیکھیے سنن النسائی: کتاب الطھارۃ باب ۸۵ اور سنن ابن ماجہ: کتاب الطہارۃ باب ۶)

اس روایت میں وضو کے نتیجے میں غلطیوں اور گناہوں کے نکلنے اور جھڑنے کی نبی ﷺ نے جو صراحت فرمائی ہے تو اس کا تعلق صرف زمرۂ مومنین سے ہے۔ زمرۂ منافقین کے لوگ قطعی طور پر اس میں شامل نہیں ہیں۔ گویا قرآن و حدیث میں اس طرح کے جتنے بھی وعدے بیان ہوئے ہیں اور جتنے بھی اجر و ثواب کا اظہار ہوا ہے وہ منافقین کے لیے نہیں بلکہ اہل ایمان کے لیے بیان ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مومنین سے لغزشیں ہی سرزد ہوتی ہیں اس لیے کہ ایمان کے ساتھ کوئی آدمی کبائر اور معاصی میں آلودہ ہونے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جو بھی خرافات قسم کا آدمی ہو تو اگر وہ وضو کر لے گا تو اس کی تمام لغویات صاف ہو جائیں گی۔ یہ مومنین ہی ہیں جن سے بڑے ثواب کے وعدے کیے گئے ہیں۔ یہ بنیادی بات یاد رکھنے کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں حساب یوں ہو گا کہ اللہ کی میزان میں جس کے اعمال صالحہ کا پلہ بھاری ہو گا تو وہ نجات پائے گا اور جس کے اعمال سیئہ کا پلہ بھاری ہوا تو وہ گڈھ میں گرے گا، اور یہ ترازو اعمال کے

اخلاص کی مقدار کو تول کر صاف صاف بتا دے گی کہ ایک عمل میں کتنا جوہر ہے اور کتنا کھوٹ۔ اب فرض کیجئے کہ آپ کے سب کے سب اعمال صالحہ ترازو میں جمع ہوتے رہے اور جمع ہوتے ہوتے اس مقام تک پہنچ گئے کہ ابھی دونوں پلڑے برابر سرابر ہی ہوئے ہیں لیکن کوئی چھوٹا عمل ایسا ہو گیا جس نے پلڑے کو بھاری کر دیا تو قانون الٰہی کی رو سے آپ کی نجات ہو جائے گی۔ اس سے یہ سبق نکلتا ہے کہ چاہے کتنا ہی چھوٹا عمل ہو اس کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیا معلوم آپ کی میزان اس کے ذریعے ہی بھاری ہو جائے۔ اسی لیے جو محتاط لوگ ہیں تو وہ راستہ چلتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

لا تحقرنّ من المعروف شیئًا ولو ان تلقیٰ اخاک بوجہ طلق

(صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب، باب ۴۳)

(نیکی کے کسی عمل کو ہرگز حقیر نہ سمجھو خواہ وہ اپنے دوسرے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی کیوں نہ ہو۔)

اس روایت میں سر اور کان کو یکجا کر دیا ہے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ الاذنان من الراس (کان سر میں شامل ہیں) لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ اس بات پر اجماع ہے کہ کان سر کا حصہ نہیں ہیں اس لیے انہیں وضو میں الگ سے لینا چاہیے اور نئے سرے سے پانی لے کر کانوں کا مسح کرنا چاہیے۔ گویا اس معاملے میں دونوں مسلک ہیں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں اس روایت کے مطابق کانوں کا مسح سر کے مسح کے ساتھ ہی کر لیتا ہوں۔

ثم کان مشیہ الی المسجد و صلاتہ نافلۃ لہ کا مطلب یہ ہے کہ اس آدمی نے صرف وضو کے ذریعے ہی اس قدر ثواب حاصل کر لیا۔ باقی رہ گیا اس کے بعد اس کا سوئے مسجد چلنا اور ادائیگی نماز تو یہ اس کے لیے نافلہ ہوں گے۔ یعنی اس کا اجر سوا ہو جائے گا۔

۵۔ وَحَدَّثَنِی عَن مَالِکٍ عَنْ سُھَیلِ بْنِ اَبِی صَالِحٍ عَنْ اَبِیہِ عَنْ اَبِی ھُرَیرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِذَا تَوَضَّاَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ (اَوِ الْمُؤمِنُ) فَغَسَلَ وَجْھَہٗ خَرَجَتْ مِنْ وَجْھِہٖ کُلُّ خَطِیْئَۃٍ نَظَرَ اِلَیْھَا بِعَیْنَیْہِ مَعَ الْمَاءِ (اَوْ مَعَ اٰخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ). فَاِذَا غَسَلَ یَدَیْہِ خَرَجَتْ مِنْ یَدَیْہِ کُلُّ خَطِیْئَۃٍ بَطَشَتْھَا یَدَاہُ مَعَ الْمَاءِ (اَوْ مَعَ اٰخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ) فَاِذَا غَسَلَ رِجْلَیْہِ خَرَجَتْ کُلُّ خَطِیْئَۃٍ مَشَتْھَا رِجْلَاہُ مَعَ الْمَاءِ (اَوْ مَعَ اٰخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ) حَتّٰی یَخْرُجَ

نَقِیًّا مِنَ الذُّنُوبِ.

ترجمہ:۔ ...... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب بندہ مسلم (یا بندہ مومن) وضو کرتا ہے اور اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے ہر گناہ، جس کی طرف اس نے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہو، اس پانی کے ساتھ (یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ) نکل جاتا ہے۔ پس جب وہ اپنے دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے تمام وہ گناہ نکل جاتے ہیں جن کو اس نے ہاتھ لگایا ہوا ہوتا ہے، اس پانی کے ساتھ (یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ) پس جب وہ اپنے دونوں پاؤں دھوتا ہے تو اس کے سارے گناہ، جن پر اس کے پاؤں چلے ہوئے ہوتے ہیں، اس پانی کے ساتھ (یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ) نکل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

وضاحت:۔ معنوی اعتبار سے یہ روایت مذکورہ بالا روایت سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں وضو سے گناہوں کے جھڑنے کا مضمون مزید واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی یہ بات صاف طور پر بیان ہوئی ہے کہ یہ معاملہ صرف بندۂ مومن یا سچے مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ منافقین اس میں شامل نہیں ہیں۔

۶۔ وَحَدَّثَنِی عَن مَالِکٍ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِی طَلْحَۃَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ اَنَّہٗ قَالَ: رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ وَحَانَتْ صَلَاۃُ الْعَصْرِ فَالْتَمَسَ النَّاسُ وَضُوْءًا فَلَمْ یَجِدُوْہُ. فَاُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِوَضُوْءٍ فِی اِنَاءٍ. فَوَضَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِی ذٰلِکَ الْاِنَاءِ یَدَہٗ، ثُمَّ اَمَرَ النَّاسَ یَتَوَضَّؤُنَ مِنْہُ. قَالَ اَنَسٌ: فَرَاَیْتُ الْمَاءَ یَنْبُعُ مِنْ تَحْتِ اَصَابِعِہٖ. فَتَوَضَّاَ النَّاسُ حَتّٰی تَوَضَّؤُا مِنْ عِنْدِ اٰخِرِھِمْ.

ترجمہ:۔ ...... انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جبکہ نماز عصر کا وقت ہو گیا تھا اور لوگ وضو کے لیے پانی کی تلاش میں تھے لیکن پانی نہیں ملا۔ تو رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک برتن میں وضو کے لیے پانی لایا گیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس برتن میں اپنا دست مبارک ڈالا۔ پھر لوگوں کو حکم دیا کہ اب لوگ اس سے وضو کریں۔ انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ پانی حضور ﷺ کی انگلیوں کے نیچے سے ابل رہا ہے۔ پھر لوگوں نے وضو کیا یہاں تک کہ آخری آدمی تک ہر ایک نے وضو کر لیا۔

وضاحت:۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے پانی کی کمی کی وجہ سے اپنا دست مبارک پانی کے برتن میں ڈالا تو قلیل پانی بھی کفایت کر گیا اور تمام حاضرین اس سے متمتع ہوئے۔ یہ آنحضرت ﷺ

کی برکت تھی۔ اس برکت کے ظہور کے مواقع متعدد بار پیش آئے۔

بعض موقعوں پر کھانوں کے متعلق بھی یہ روایت آتی ہے کہ توشہ بہت تھوڑا تھا تو آپ نے برکت کی دعا فرما کر جو ہاتھ ڈالا تو جماعت کی جماعت کے لیے کافی ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس طریقے کی برکتیں اپنے انبیاء کے علاوہ دیگر اہل ایمان کے ذریعے بھی ظاہر فرماتا ہے اور اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی برکتیں اپنے نیک بندوں کے ذریعے بھی ظاہر فرمائے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ پیغمبر کے متعلق تو یہ بات بلاشبہ قطعی طریقے سے کہی جاسکتی ہے لیکن دوسرے لوگوں کے متعلق ایسی روایتوں کی قبولیت میں احتیاط ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ بات مستبعد تو نہیں ہے البتہ اتنی عام بھی نہیں ہے۔ برکت ظاہر ہوسکتی ہے بشرطیکہ آدمی اللہ تعالیٰ سے خلوص رکھتا ہو اور وہ اس کے لیے نہایت خلوص سے دعا بھی کرے۔

۷۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نُعَيْمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْمَدَنِيِّ الْمُجْمِرِ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَاهُرَيْرَةَ يَقُولُ: مَنْ تَوَضَّاَ فَاَحْسَنَ وُضُوءَهٗ ثُمَّ خَرَجَ عَامِدًا اِلَى الصَّلَاةِ. فَاِنَّهٗ يُكْتَبُ لَهٗ بِاِحْدَى خُطْوَتَيْهِ حَسَنَةٌ" وَيُمْحَى عَنْهُ بِالْاُخْرَى سَيِّئَةٌ" فَاِذَا سَمِعَ اَحَدُكُمُ الْاِقَامَةَ فَلَا يَسْعَ. فَاِنَّ اَعْظَمَكُمْ اَجْرًا اَبْعَدُكُمْ دَارًا. قَالُوا: لِمَ يَا اَبَاهُرَيْرَةَ؟ قَالَ: مِنْ اَجْلِ كَثْرَةِ الْخُطَا.

ترجمہ:۔۔۔۔۔ نعیم بن عبداللہ مدنی مجمر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا کہ جس نے وضو کیا اور اچھی طرح سے وضو کیا، پھر وہ نماز کا قصد کرتا ہوا نکلا تو وہ اپنی نماز ہی میں ہوتا ہے جب تک کہ وہ نماز کے قصد میں چل رہا ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے ایک قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور دوسرے قدم سے اس کی ایک برائی محو کی جاتی ہے۔ تو جب تم میں سے کوئی اقامت سنے تو دوڑے نہیں کیونکہ تم میں سب سے زیادہ اجر اس کے لیے ہے جس کا گھر سب سے زیادہ دور ہے۔ لوگوں نے پوچھا: ابوہریرہ! یہ کیوں ہوگا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ قدموں کی کثرت کی وجہ سے۔

وضاحت:۔ یہ بہت قیمتی روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب آدمی نماز کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے تو اسی وقت سے وہ نماز میں ہوتا ہے۔ وہ وضو کرے گا، قدموں سے چل کر مسجد میں پہنچے گا تو اس کا سارا عمل بمنزلہ نماز ہوگا۔ چلتے وقت اس کے ایک قدم پر نیکی لکھے جانے اور دوسرے قدم پر ایک گناہ محو ہونے کی بات بالکل منطقی ہے۔ اس لیے کہ جب ایک نیکی لکھی جائے گی تو لازماً ایک برائی مٹے گی بھی۔

فلا یسع: تو دوڑنے کی کوشش نہ کرے۔ یعنی مسجد سے جس کا گھر دور ہے تو ظاہر ہے کہ دوڑنے سے اس

کے قدم لمبے ہو جائیں گے۔ جتنی مستعدی کے ساتھ چل کر آپ مسجد تک پہنچیں گے اتنے ہی کم قدموں میں دوڑ کر مسجد پہنچ جائیں گے تو نتیجۃً آپ کا اجر کم ہو جائے گا۔ اور وقار کے خلاف آپ کی جو حرکت ہوگی یہ الگ جرم ہے۔ حکم ہے کہ نماز کے لیے جائیں تو نہایت سکون اور وقار کے ساتھ جانا چاہیے۔ اس سے آپ کا اجر وثواب بڑھتا ہے۔ لہٰذا اسی وقار کے ساتھ جتنی دیر میں بھی آپ مسجد تک پہنچیں گے تو آپ گویا نماز ہی میں ہوں گے اور آپ کو کثرت خطا کا ثواب بھی ملے گا، اس لیے کہ ہر قدم کے اوپر ثواب ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نماز کے لیے جانے والے کی توجہ نماز ہی کی طرف رہے۔ راستے میں نماز سے غیر متعلق حرکات ومصروفیات اس میں شامل نہیں ہیں۔

۸۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّهٗ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يُسْاَلُ عَنِ الْوُضُوءِ مِنَ الْغَائِطِ بِالْمَاءِ. فَقَالَ سَعِيدٌ": اِنَّمَا ذٰلِكَ وُضُوءُ النِّسَاءِ.

ترجمہ:۔۔۔۔۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ انہوں نے سنا کہ سعید بن مسیب سے پاخانہ سے فارغ ہو کر اس کو پانی سے دھونے کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ عورتوں کا طریقہ ہے۔

وضاحت:۔ الوضوء۔ یہاں وضو سے مراد دھونا ہے۔ یہاں یہ اصطلاحی معنوں میں نہیں آیا ہے۔ یہ وہی معنی ہیں جو ہم نے پیچھے 'ترک الوضوء مما مسته النار' والی روایات میں لیے ہیں۔ یعنی حالت وضو میں اگر آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز کھالی جائے تو فقط پانی سے منہ دھولینا کافی ہے۔

عرب میں پانی بچانے کے خیال سے مردوں کے لیے طہارت کے لیے پتھر وغیرہ سے استنجے کا عام رواج تھا۔ البتہ عورتوں کے لیے پانی کا استعمال تہذیب میں داخل تھا۔ حضرت سعید بن مسیب فقیہ آدمی ہیں۔ ان سے اس روایت کا قرینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس خاص ماحول کو ملحوظ رکھ کر جواب دیا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ بحث چل رہی ہوگی کہ دھونے کا عمل افضل ہے یا ڈھیلے سے استنجا کا، تو اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے انہوں نے ان لوگوں کو قائل کرنے کے لیے جو مردوں کے لیے پانی کے استعمال کو ترجیح دیتے رہے ہوں کہہ دیا کہ یہ طریقہ تو عورتوں کا ہے۔ اس لیے کہ اگر اس چیز کو فضیلت حاصل ہو جائے تو پانی کی کمیابی کے علاقوں کی زندگی میں تو بڑی زحمتیں پیدا ہوں گی۔

حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق پتھر وغیرہ کے استعمال کے بعد پانی کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بات یاد رکھیے کہ حضرت سعید بن مسیب کوئی بات تشدد یا غلو کی بنا پر نہیں کہتے ہیں۔ لہٰذا ان کا یہ فتویٰ غلو پر مبنی نہیں ہے۔

میری رائے میں پانی سے طہارت افضل ہے۔ پتھر وغیرہ سے استنجا بہر حال مجبوری کا سودا ہے۔ جن لوگوں نے یہ لے زیادہ بڑھا دی ہے وہ قابل لحاظ نہیں ہے۔ پانی کے علاوہ کوئی چیز بھی طہارت کے نقطۂ نظر سے 'دوسرے درجے میں ہے۔ کسی نے بھی کسی دوسری چیز کا اول درجہ نہیں قرار دیا ہے۔ ابن مسیب نے عرب کے حالات کے لحاظ سے ان لوگوں کے ذہن کو ذرا ٹھوکر لگائی ہے جو پانی کو افضل قرار دیتے رہے ہیں۔ پانی کے معاملے میں بعض لوگوں نے اتنا غلو کیا ہے کہ بس بہائے چلے جاتے ہیں ان کا وضو ہی نہیں ہوتا۔ یہ دوسری انتہا ہے۔

۹۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ.

ترجمہ:۔۔۔۔۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں پانی پی لے تو چاہیے کہ اس کو سات مرتبہ دھولے۔

وضاحت:۔ کتا طوافین وطوافات کے حکم میں 'بلی کی طرح' شامل نہیں ہے۔ حالانکہ صاحب لوگوں نے طوافین وطوافات تو کیا اس بیچارے کو گویا 'معشوقین ومعشوقات' کا درجہ دے رکھا ہے۔ اسلام میں کتا نجس کے درجے میں ہے۔ اگر وہ کسی کے برتن میں پانی پی لے تو اس برتن کو عام طریقے سے سات مرتبہ دھونے کا حکم ہے۔ اور بعض روایات کی رو سے اول مرتبہ یا آخری مرتبہ مٹی سے رگڑ کر دھونے کا حکم بھی آتا ہے۔ دھوئیں گے کل سات مرتبہ ہی۔ راکھ سے بھی دھو سکتے ہیں۔ فی زمانہ صابن کی سہولت سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ مقصود سادہ دھونے پر اہتمام مزید اختیار کرنا ہے۔

میرے علم کے مطابق ماسوائے حنفیہ کے سب مسالک کا، جیسا کہ اس روایت میں بھی ہے، سات مرتبہ دھونے پر اتفاق ہے۔ حنفیہ اس معاملے میں اپنے روایتی عقلی گدے لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ نہ تو سات مرتبہ دھونے کی قید کی ضرورت ہے اور نہ مٹی سے رگڑنے کی۔ بس دھو دیں پاکی کے لیے کافی ہے۔ ان کے مذہب کے رواج پانے کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں یہ سب زحمتیں نہیں ہیں۔ لیکن باقی سب لوگوں کا سات کے عدد پر اتفاق ہے۔ میں چونکہ نرا عقلی آدمی نہیں ہوں اس لیے سات مرتبہ دھونے کے مسلک کو صحیح سمجھتا ہوں۔

میں جن دیہاتوں میں پلا ہوں یا رہا ہوں ان میں یہ رواج ہے کہ مٹی کے کسی برتن میں اگر کتا پانی پی لے یا منہ لگا دے تو وہ ناپاک سمجھا جاتا ہے اور اسے بالعموم پھینک ہی دیا جاتا ہے۔ البتہ دھاتی برتن

دھوئے جاتے ہیں اور انہیں مٹی، راکھ وغیرہ سے رگڑا بھی جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک روایت کے سیدھے سادے مطلب کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔ غیر ضروری قیود آزادی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۱۰۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اسْتَقِيمُوا وَلَنْ تُحْصُوا وَاعْمَلُوا وَ خَيْرُ أَعْمَالِكُمُ الصَّلَاةُ. وَلَا يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوءِ إِلَّا مُؤْمِنٌ".

ترجمہ:۔۔۔۔۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو رسول اللہ ﷺ سے یہ بات پہنچی کہ آپ نے فرمایا: (خدا کے راستے پر) سیدھے جمے رہو اگرچہ پورا اہتمام تم کہاں کر سکتے ہو! اور عمل کرو اور تمہارا بہترین عمل نماز ہے۔ اور وضو کا اہتمام تو مومن کے سوا کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔

وضاحت:۔ یہ روایت بہت حکیمانہ اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ یعنی علم ومعرفت کا ایک خزانہ ہے۔

اسْتَقِيمُوا۔ یعنی صراط مستقیم پر سیدھے رہو۔

وَلَنْ تُحْصُوا۔ یعنی اگرچہ تم پورے طریقہ سے اس کا اہتمام نہیں کر سکتے تاہم جہاں تک ہو سکے دین کے معاملے میں سیدھے رہو۔ اس کے بعد رعایت بتائی ہے کہ تم پورا حق کہاں ادا کر سکتے ہو لیکن اپنی بساط کے مطابق کوشش کرنا ضروری ہے۔

وَاعْمَلُوا۔ یعنی دین کے تمام احکام پر عمل کرو۔

ایمان کے بعد حضور ﷺ نے اس کا پہلا مظہر نماز بتایا۔ دوسری روایت میں ہے کہ جس میں نماز نہیں ہے اس میں ایمان نہیں ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ "مَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ"۔ (موطا امام مالک: کتاب وقوت الصلاۃ باب ۱) جس نے نماز ضائع کی تو بقیہ دین کو وہ بدرجۂ اولیٰ ضائع کر بیٹھے گا۔ اصل چیز نماز ہی ہے۔ پھر اس سے باقی دین وجود میں آئے گا۔

وَلَا يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوءِ إِلَّا مُؤْمِنٌ"۔ یعنی اہتمام وضو مومن کی شان کا حصہ ہے۔ یہی وہ حدیث ہے جس نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ سردیوں میں یخ پانی سے بھی اسالت ماء کا اہتمام کروں، چاہے وہ اعضاء کو کاٹ کے رکھ دے۔ اس لیے کہ اس التزام کے بغیر کوئی مومن نہیں ہو سکتا۔

(ترتیب: ماجد خاور)

خالد مسعود

رسول اللہ ﷺ کی بعثت عام اور ختم نبوت

رسول اللہؐ کی بعثت اگرچہ قریش میں ہوئی، آپ کے پاس جو کلام الٰہی تھا وہ بھی قریش کی زبان میں تھا، اور انہی کے اندر آپ نے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ صرف قریش کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اپنی قوم کی اصلاح آپ کا اولین فریضہ ضرور تھا جیسا کہ آیت وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ کا تقاضا تھا۔ لیکن آپ پر یہ بات بھی واضح تھی کہ آپ کا کام قریش کو تبلیغ پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آپ کے مخاطب دوسرے قبائل اور اقوام بھی ہیں۔

یہ حقیقت حضور کے بارے میں سابق انبیاء کی پیشینگوئیوں سے بھی واضح تھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ فرمایا اس کے الفاظ یوں نقل ہوئے ہیں:

"ابراہیم کی اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور ان کی نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی"۔ (پیدائش۔۲۲:۱۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قوموں کے برکت پانے کی شرط حضور نبی کریم ﷺ سے پہلے کبھی پوری نہیں ہوئی۔ عیسائیت کو اقوام عالم میں ضرور فروغ حاصل ہوا لیکن اس کا واسطہ نسل ابراہیم نہ بنی بلکہ دوسرے لوگ بنے۔

یوحنا کی انجیل میں حضور کو دنیا کا سردار کہا گیا۔ (یوحنا:۱۴) جو آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا۔ (یوحنا۔۱۶:۸) وہ سچائی کا روح ہوگا جو کامل سچائی کی راہ دکھائے گا۔ (۱۶:۱۳) وہ ایک ایسا مددگار ہوگا جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا۔ (۱۶:۱۴۔۲۷)

تاریخ عالم میں ان پیشینگوئیوں کا مصداق حضورؐ کے سوا کوئی نہیں۔

ان پیشینگوئیوں میں تین باتیں نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ اس رسول کے پاس کامل سچائی یا مکمل حق ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں پچھلے انبیاء کے پاس جو دین تھا وہ ان کی قومی یا زمانی ضروریات کے لحاظ سے تھا اور نا تمام تھا لیکن حضور کامل دین کو پیش کریں گے اور آپ کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ دوسری یہ

کہ اس کی رسالت ابد تک کے لیے ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ابد تک ساتھ رہنے سے مراد شخصی حیثیت سے رہنا نہیں کیونکہ اس دنیا میں بقائے دوام کسی کو حاصل نہیں۔ مراد اس رسول کی لائی ہوئی ہدایت کا باقی رہنا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو محفوظ شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گی۔ لہٰذا حضور کی بعثت کے بعد رہتی دنیا تک کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ آپ آخری نبی ہوں گے۔ تیسری یہ کہ وہ پوری دنیا کے لیے رسول ہوگا اور تمام اقوام عالم اس سے فیض پائیں گی۔ اس کی نبوت کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کے لیے ہوگی اور اس میں مجموعی طور پر انسان کی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہوگا۔ یہ شرط بھی کسی سابق رسول کی ذات میں پوری نہیں ہوتی۔ مسیح علیہ السلام بہت بڑے رسول تھے لیکن وہ صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ انہوں نے اس بات کو دوٹوک انداز میں بیان کیا اور قرآن نے بھی ان کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوں۔ پیشینگوئیوں کا یہ حصہ بھی رسول اللہ ﷺ کی قامت پر پورا اترتا ہے۔ قرآن مجید نے یہ تمام باتیں نبی ﷺ کے بارے میں خود بیان کی ہیں۔ فرمایا:

"اور ہم نے تم کو بس اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔ (انبیاء:۱۰۷)

"اور ہم نے تم کو سب لوگوں کے واسطے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں"۔ (سبا:۲۸)

چونکہ عملاً یہ ایک ناممکن بات تھی کہ حضور پوری دنیا کے لوگوں تک پہنچتے اور ان کو دین حق سے آگاہ کرتے، اس کو ماننے والوں کو حسن انجام کی نوید سناتے اور انکار کرنے والوں کو بدانجامی سے خبردار کرتے۔ لہٰذا قرآن نے یہ بات واضح کر دی کہ رسول کی ذمہ داری اپنے سامنے والے لوگوں کو ہدایت پہنچا دینے تک محدود ہوگی، دوسرے لوگوں پر اس ہدایت کی گواہی وہ لوگ دیں گے جو آپ پر ایمان لائیں گے۔

"اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے"۔ (بقرہ:۱۴۳)

اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضور کی بعثت کے دو پہلو تھے۔ آپ کی بعثت خاص تو قریش اور دوسرے قبائل عرب کی طرف تھی لیکن بعثت عام ساری دنیا کے لوگوں کی طرف تھی اور اس کے لیے وسیلہ آپ کی تیار کردہ امت نے بننا تھا۔

حضور نے جب حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کیا تو منافقین نے پروپیگنڈا کا طوفان کھڑا کر دیا جس میں حضور کو استقامت کی تلقین ہوئی۔ اس ضمن میں قرآن نے یہ بھی فرمایا:

''محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہی ہر چیز سے باخبر ہے''۔ (احزاب: ۴۰)

حضور کے اللہ کا رسول ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ آپ اپنے مخاطبوں کو دین حق کا ابلاغ کامل طریقہ سے کریں گے اور ان لوگوں پر اتمام حجت ہو جائے گا جن تک آپ کی دعوت پہنچے گی۔ نبیوں کے خاتم ہونے کا معنی ہے آخری نبی۔ خاتم کسی قوم کے آخری فرد کو کہتے ہیں۔ نبیوں کے خاتم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمرۂ انبیاء کے آپ آخری فرد ہیں۔ آپ کی ذات کے آ جانے کے بعد قصر نبوت کی اس طرح تکمیل ہوتی ہے کہ اب اس میں کوئی رخنہ باقی نہیں رہا جس کو بند کرنے کے لیے مزید کسی نبی کی بعثت کی ضرورت پڑے۔ گویا رسول اللہ ﷺ کے منصب کا تقاضا یہ تھا کہ آپ وہ تمام کام انجام دیں جو تکمیل دین وشریعت کے لیے ضروری ہوں۔ اسی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے آپ نے قرآن کے احکام کی وضاحتیں کیں۔ ان کے اوپر خود عمل کر کے وہ طریقہ روشن کیا جس پر چل کر آدمی دین کی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ حضور کی بیان کردہ یہی وضاحتیں اور اعمال وافعال آپ کی سنت کہلاتے ہیں۔

ماضی میں وقت گزرنے کے ساتھ ہدایت کا کچھ حصہ گم یا ناپید ہو جاتا رہا۔ بعض اوقات کوئی بدبخت امت اپنے نبی کی تعلیم کو مسخ کرنے اور اس میں تحریف کر دینے کی مرتکب ہوئی۔ تب یہ ضروری ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کے ساتھ کیے گئے وعدہ کے مطابق دوسرا رسول یا نبی بھیج کر اپنی ہدایت کو پھر سے قائم کرے۔ حضور پر جو ہدایت اتاری گئی اس کو ناپید ہونے سے بچانے کے لیے اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھا لیا تاکہ یہ کتاب ابد تک انسانوں کے ساتھ رہے۔ فرمایا:

''یہ یاددہانی ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ (حجر: ۹)

یہ انتظام ضروری تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوا۔ قرآن مجید کا ایک ایک حرف اسی طرح محفوظ ہے جس طرح رسول اللہ نے اسے امت کے حوالہ کیا تھا۔ چونکہ نبی کی بعثت ہدایت کے ابلاغ کے لیے ہوتی ہے اور حضور کی لائی ہوئی ہدایت اقوام عالم کے استفادہ کے لیے محفوظ ہے اس لیے حضور پر نبوت ختم کر دی گئی اور آپ خاتم النبیین ہیں جن کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے منصب کے مختلف پہلوؤں کو راز نہیں رکھا بلکہ اپنے قول اور عمل سے ان کو اچھی طرح اجاگر کیا۔ مثلاً حضور نے اپنے خاتم النبیین ہونے کو ایک تمثیل سے سمجھایا۔ آپ نے فرمایا کہ میری اور دوسرے انبیاء کی تمثیل یوں ہے جیسے ایک آدمی نے عمارت بنائی تو نہایت حسین وجمیل بنائی مگر عمارت کے گوشوں میں سے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھی۔ لوگ عمارت کے گرد گھومتے تو عمارت ان کو لبھاتی۔ پھر وہ اس آدمی سے یہ کہتے کہ تو نے کیوں ایک اینٹ یہاں نہ لگا دی کہ تمہاری عمارت مکمل ہو جاتی۔ حضور نے فرمایا 'وہ اینٹ میں ہوں اور میں آخری نبی ہوں'۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کا قصر تعمیر ہوا تو خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء نے اس عمارت کی خوبصورتی اور دلکشی میں اپنا حصہ ادا کیا۔ رسول اللہ کی بعثت سے پہلے یوں تو عمارت تعمیر ہو چکی تھی لیکن ایک اینٹ لگنا ابھی باقی تھا۔ رسول اللہ نے یہ خلا بھر دیا اور عمارت کی تکمیل کر دی۔ اب اس میں مزید ایک اینٹ لگنے کی گنجائش بھی باقی نہیں ہے۔ لہٰذا سلسلہ انبیاء ختم کر دیا گیا۔

اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ آپ کی بعثت تمام اقوام عالم کی طرف ہوئی ہے آپ نے عملی اقدامات کیے، آپ نے عرب قبائل کی طرف وفود بھیجے، اردگرد کی ریاستوں اور سلطنتوں کے حکمرانوں کو دعوتی خطوط لکھے اور ان کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بہت سے اہم سردار اور ملوک دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ جہاں تک اسلام کے روشناس ہونے کا تعلق ہے تو وہ اس دور کی سب سے بڑی مملکتوں میں غیر معروف نہیں رہا۔

بعض لوگ ختم نبوت کے تصور پر یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ کی بعثت کو تو چودہ سو سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران میں انسان ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ تہذیب و تمدن میں اتنی بڑی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں جس کی نظیر ماضی میں نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں ختم نبوت کا نظریہ نسل انسانی کو پیغمبروں کی رہنمائی سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا ادارہ انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ ادارہ ہے جس کے اصول وضوابط خود اسی کے معین کردہ ہیں۔ ان اصول وضوابط کے مطابق رسول اس وقت بھیجا جاتا ہے جب اللہ کا کلام تلف کر دیا گیا ہو اور وہ رہنمائی کے لیے موجود نہ ہو۔ رسول دوبارہ اس کو پیش کرتا اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔ حضور کے بعد اللہ کا کلام بھی محفوظ ہے اور آپ کی پیش کردہ وضاحتیں بھی۔ ان دونوں سے آج بھی ایک نیک

نیت انسان رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ باقی رہا ہدایت دینے کا کام تو یہ اللہ کے اختیار کی چیز ہے۔ رسول کی موجودگی میں بھی اللہ تعالیٰ خود ہی بندوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرماتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں بھی وہی بندوں کو ہدایت سے نوازتا ہے۔ لہٰذا قرآن اور سنت رسول کی حفاظت کے باعث نئے نبی کی بعثت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جہاں تک نئے مسائل کے پیدا ہونے کا تعلق ہے تو رسول اللہ نے اپنی امت کو اس کی تربیت دے دی کہ وہ کس طرح قرآن وسنت کے احکام کی روشنی میں ان پر قیاس کرکے نئے مسائل کا حل اجتہاد کے عمل سے نکالے۔ اس رہنمائی کے طفیل اسلام ہر دور کے مسائل کا بخوبی مواجہہ کرسکتا ہے۔

جہاں تک انسان کی ترقیوں کا تعلق ہے یہ اخلاقی وروحانی دائرہ میں نہیں ہوئیں جس دائرہ سے نبیوں کو بحث ہوتی ہے۔ یہ ترقیاں طبیعی (Physical) میدان میں ہوئی ہیں جس سے دین صرف اسی وقت تعرض کرتا ہے جب یہ اخلاقی اقدار سے متصادم ہوں۔ قرآن نے جو نظام اخلاق پیش کیا ہے وہ آج بھی انسانیت کی رہنمائی کے لیے موجود ہے اور اتنا جامع وارفع ہے کہ انسان اپنی خیرہ کن ترقیوں کے باوجود اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر انسان محمد ﷺ کے پیش کردہ نظام اخلاق اور خیر وشر کے تصورات کو اختیار کرچکا ہوتا اور اس سے اس کے شوق پرواز کی تسکین نہ ہوتی بلکہ اس سے مزید بہتر نظام اخلاق کا طالب ہوتا اور قرآن سے اس کی یہ ضرورت پوری نہ ہوتی تب ختم نبوت کے تصور پر تنقید کرنا جائز ہوسکتا تھا۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے پست سے پست تر ہوتا جارہا ہے۔ قرآن ہدایت کے لیے موجود ہے لیکن اس کی طرف سے وہ آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔

اجتماعی معاملات میں قرآن نے تعلیم کا جو انداز اختیار کیا ہے اس میں دین کے بنیادی مطالبات بتادیے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔ باقی رہ گیا ان کا تفصیلی ڈھانچہ تو اس کی تعمیر کو انسانوں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ دین کے بنیادی مطالبات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان میں اپنے دور کی ترقیوں کے مطابق کوئی سی شکل دے لیں۔ انسان اگر اس طریق کار کو اپنالے تو نہ وہ آسمانی ہدایت سے محروم رہتا ہے اور نہ تہذیب وتمدن کی ترقیاں اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرتی ہیں۔

ایک اور اعتراض جو ختم نبوت کے تصور پر کیا جاتا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ کے بعد متعدد لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور لوگوں کو اپنے پیغام سے متاثر بھی کیا ہے۔ لہٰذا تاریخی طور پر یہ تصور حقیقت ثابت نہیں ہوتا۔ جہاں تک سلسلہ نبوت کا تعلق ہے اس کی کڑیاں باہم دگر پیوست ہیں۔ تمام انبیاء کا دین

اپنی بنیاد واساس کے حوالہ سے ایک ہی رہا۔ ان کی دعوت اللہ کی وحدانیت کے اقرار، اس کی صفات کے تقاضوں کے استحضار، نیکی وبدی کے شعور کو پختہ کرنے، نیکی کو پھیلانے اور برائی کا قلع قمع کرنے، اور آخرت کا یقین پیدا کرنے پر مشتمل رہی اور اس کے بارے میں رہنمائی ان کو وحی کے ذریعہ سے ملتی رہی۔ انبیاء اعلیٰ اخلاق وکردار کا ایسا نمونہ ہوتے کہ ان کی شخصیت اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں ہوتی۔ دعوت دین دیتے ہوئے اللہ کے قانون کے مطابق ان کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا جس کے بعد ان کے مشن کی تکمیل ہوتی۔ محمد رسول اللہ کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ان کے پاس وحی کی کوئی تعلیم نہ تھی جس کو لوگ پہچان کر کہہ سکتے کہ یہ تعلیم اسی سرچشمہ سے پھوٹی ہے جس سے تورات، انجیل اور قرآن مجید کی تعلیمات پھوٹی تھیں۔ ان کی دعوت میں سلسلہ انبیاء کی دعوت کے عناصر نظر نہیں آتے بلکہ ان مدعیان نبوت نے عفت وپاکیزگی کے اس نظام کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی جس کو انبیاء نے قائم کیا۔ انہوں نے اباحیت کا دروازہ کھولا اور بالعموم اخلاق سے عاری لاخیرے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کے پاس اخلاق وکردار اور خلوص وللہیت کی وہ بلندی نہ تھی جو اصل نبیوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ معدودے چند لوگوں کے سوا ان کے ہم عصر انسانوں نے ان کی نبی ہونے کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا ان کی دعوت کو بقا حاصل نہیں ہوئی۔ ایک وقتی ہیجان برپا کرکے وہ ایک محدود سا فرقہ بنا سکے اور اسی دوران دنیا کے منظر سے ہٹ گئے۔ بیشتر مدعیوں کی موت کے ساتھ ان کا مذہب بھی ختم ہوگیا۔ یہ لوگ جب تک زندہ رہے وہ ان مراحل سے نہیں گزرے جن سے انبیاء کا گزرنا اللہ کے قانون کے تحت ضروری ہے۔ لہٰذا یہ تمام مدعیان نبوت اصل نبیوں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کی حیثیت اسی طرح کی ہے جس طرح کوئی کوا سفید روغن لگا کر ہنسوں کی ڈار میں شامل ہونے کی کوشش کرے۔ محمد رسول اللہ اپنی دعوت، اپنے اخلاص وکردار، اپنے آسمانی کلام، اپنے پیروکاروں کی نیکی، اپنی جدوجہد کے نتائج اور دین کی وسعت کے لحاظ سے بالکل ممتاز ہیں۔ حضور کے مماثل نہ کوئی نبی آپ سے پہلے آیا نہ آپ کے بعد پیدا ہوا۔

امین احسن اصلاحی

اللہ تعالیٰ کی صفت تکبر کا مفہوم اور اس کا تقاضا

سوال: اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے اندر اجاگر کرنے سے اخلاق عالیہ پیدا ہوتے ہیں جب کہ اس کی ایک صفت المتکبر بھی ہے، کیا یہ صفت بھی اپنے اندر پیدا کرنا مطلوب ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی صفت المتکبر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کا، اپنی صفات کا، اپنے علم کا، اپنی شان کا شعور رکھتا ہے۔ اس لیے کوئی صفت جو اس کی شان کے خلاف ہو اگر آپ اس کے ساتھ جوڑ دیں گے تو وہ اس کو پھینک مارے گا۔ یہ بات بھی ہے کہ کبریائی اسی کا حق ہے اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کہے کہ میں خالق ہوں، جو چاہے کروں، تو یہ بات حقیقت ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ تو نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ بھی ہوا باندھیں کہ ہم چو ما دیگرے نیست تو آپ کس برتے پر باندھیں گے۔ اگر آپ اس کی اس صفت کا عکس اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو سنئے، آپ اپنے میں خودداری پیدا کیجئے۔ اپنے میں کامل اعتماد پیدا کیجئے کہ میں اپنے رب کا پیدا کیا ہوا ہوں۔ اگر میں اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلوں گا تو وہ مجھے ذلیل نہیں کرے گا۔ اپنے اندر خودی کا شعور پیدا کیجیے۔ اپنی خودی کے شعور کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ شعور ہو کہ ہم آخری دین کے حامل ہیں، آخری رسول کے پیرو ہیں، ساری دنیا کی ہدایت پر مامور ہیں اور ہمارے پاس اللہ کی جو کتاب ہے محفوظ ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ ایرے غیرے کے آگے کاسہ گدائی لیے پھریں اور ہر باطل کے آگے جھک جائیں۔ یہ خودداری قومی اور اجتماعی خودداری ہوتی ہے اور اس کا پیدا ہونا واجب ہے۔ اقبال نے خودی کا جو حوالہ دیا تو ان کے ذہن میں واضح مضمون تھا۔ وہ شاعر تھے۔ انہوں نے یہی بات کہی تھی، اچھی بات تھی کہ اپنے آپ کو جگاؤ اور سوچو کہ تم کیا ہو۔ لیکن وہ فلسفی بھی تھے اور یار لوگوں نے فلسفہ بنا دیا اور بناتے بناتے کسی نے تو صوفیوں کا وحدت الوجود بنا دیا اور کسی نے ابلیس کا استکبار بنا دیا۔

تو یہ خودداری، اللہ تعالیٰ کی شان المتکبر کا پرتو آپ میں ہے۔ ہر صفت کا آپ میں پرتو مطلوب ہے۔ بعینہٖ وہی صفت جو اللہ تعالیٰ میں ہے وہ آپ میں پیدا نہیں ہو سکتی، اس کا پرتو ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی عظمت اور کبریائی کا شعور ہے تو آپ کو اپنے مومن ہونے کا اور اللہ کے بندے ہونے کا شعور ہونا چاہیے۔

'فطرت' کا مفہوم:

سوال: آپ اپنی تحریروں اور تقاریر میں فطرت کا لفظ جا بجا استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک فطرت کا متعین مفہوم کیا ہے؟

جواب: مشکل یہ ہے کہ آپ اس چیز کی وضاحت چاہتے ہیں کہ جو خود اتنی واضح ہے کہ اس کی کوئی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ آپ اگر مجھ سے کہیں کہ سورج کی وضاحت کرو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ قرآن مجید خود یہ کہتا ہے کہ 'بل الانسان علی نفسه بصیرة ولو القی معاذیره' (انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، چاہے وہ کتنے ہی عذر تلاش کرے) دوسری جگہ فرمایا ہے کہ **فالهمها فجورها و تقوٰها** (پھر اللہ نے خود انسان کو نیکی اور بدی الہام کی) معلوم ہوا کہ ہمارے اوپر نیکی اور بدی کا الہام ہوا ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ سچائی اچھی چیز ہے، ہم جانتے ہیں کہ جھوٹ بری چیز ہے، جانتے ہیں کہ نفاق برائی ہے، جانتے ہیں کہ عزیمت اچھائی ہے، معلوم ہے کہ رحمت اچھی چیز ہے اور ظلم شیطنت ہے۔

یہ شرف مجھے حاصل ہے کہ میں جیل میں بھی رہا ہوں۔ جیل میں اکثر مجرمین سے پوچھا کرتا تھا کہ 'جی یہ کیا چیز تھی جو آپ کو یہاں لے آئی؟ تو وہ جواب دیتے کہ بس جی بری صحبت مل گئی تھی، نالائقی تھی ہماری، ہمارا قصور تھا۔ اسی طرح کے جواب دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی مجرم مجھے نہیں ملا جس نے کہا ہو کہ بے قصور لایا گیا ہوں یا یہ کہ اپنے جرم کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ جس سے بھی میں نے پوچھا اس نے یہی جواب دیا۔

فطرت کی باتیں مخفی نہیں ہیں۔ آپ یقین کریں کہ نیکی کے جتنے بھی بنیادی اصول ہیں، ایک عامی کو، ایک دہقان کو، ایک کسان کو، ایک سپاہی کو، سب کو معلوم ہیں۔ ان حقائق سے کسی کو انکار نہیں تو سوال یہ ہے کہ اب پیچ پڑا کہاں سے ہے؟ یہ سوال آپ کر سکتے ہیں اور یہ میں بتا بھی سکتا ہوں۔ نیکی کا اذعان، علم، عرفان سب کے اندر موجود ہے البتہ یہ ہے کہ نفس کے اندر جو طمع، یا خوف یا غرض یا حسد ہے، ان چیزوں کی وجہ سے ہم ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ہر شخص کے ہاں ٹھوکریں کھانے کے اسباب الگ ہوتے ہیں، لیکن یہ بتانے کی کوئی چیز نہیں، یہ بالکل واضح ہیں۔ آدمی اپنے کردار کا تجزیہ کر کے ان کو متعین کر سکتا ہے۔

حکومت کی بے انصافی سے تنگ آ کر فعل حرام کا ارتکاب:

سوال: اگر اسلام کی نام لیوا حکومت بھی اپنی رعایا کو اتنا قلیل معاوضہ دے کہ انسان اپنے اہل خانہ اور

والدین کے جائز حقوق بھی ادا نہ کر سکے بلکہ انتہائی معاشی پریشانی میں مبتلا ہو اور تنگ آ کر وہ کوئی ایسا فعل کرے جو حرام کے زمرہ میں آتا ہو تو کیا وہ شخص اللہ کے ہاں مجرم ٹھہرے گا؟ اور اگر ٹھہرے گا تو کس درجہ کا، جب کہ وہ اپنی تمام زندگی توحید اور سنت میں ڈھال رہا ہو اور اسلام پر جینے اور مرنے کی تمنا کرتا ہو۔ نیز یہ کہ اسلام کا دعویٰ کرنے والی حکومت اس ضمن میں کیا سزا کی مستحق ہوگی؟

جواب: جو شخص اسلام کے لیے جینے اور مرنے کا حوصلہ رکھتا ہے، اور ٹھیک ہے یہ رکھنا چاہیے، اس کے متعلق میں عرض کرتا ہوں کہ حکومت کی ساری نالائقیوں کے باوجود، اس پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اگر وہ اسلام پر رہنا چاہتا ہے تو حتی الامکان اس وقت تک حرام کا ارتکاب نہ کرے جب تک کہ وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے اس پر مجبور نہ ہو جائے اور اس وقت بھی اس مشکل میں یہ کرے کہ وہ نہ اس کو پسند کرنے والا ہو اور نہ اس کی طرف حد سے بڑھنے والا ہو۔ حکومت کی نالائقی اس کے لیے کوئی عذر نہیں بن سکتی۔

اس معاملہ میں بھی میں یہ عرض کر دوں کہ میرا مسلک یہ ہے کہ یہ ایک رخصت ہے اور میں ان فقہاء کا ہم خیال نہیں ہوں جو اس کو عزیمت کہتے ہیں۔ میرے نزدیک اگر کوئی باغیرت انسان جان دے دے گا لیکن حرام نہیں کھائے گا تو اللہ کے ہاں اس کا بڑا مرتبہ ہے۔ میں اسی گروہ میں ہوں اور میری آرزو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کسی سخت امتحان میں نہ ڈالے، اور اگر ڈالے تو حق پر مرنے کی توفیق دے لیکن میں حرام کھانے کو پسند نہیں کروں گا۔ میرے نزدیک ان ائمہ کا مذہب غلط ہے جو اس کو عزیمت قرار دیتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ بات بھی ہے کہ ان کی طرف اس نقطہ نظر کی نسبت بھی غلط ہوئی ہے۔

جہاں تک رعایا کے حق میں حکومت کی ذمہ داری کا تعلق ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرے تو اس کی ذمہ داری میرے سر پر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حکمران کی ذمہ داری یہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے لیے اس وقت تک خواب و خور حرام ہے جب تک کہ رعایا کی طرف سے اس کا ذہن فارغ نہ ہو۔ حکومت کی اصلی ذمہ داری غرباء کے لیے ہے جن کے پاس وسائل اور ذرائع نہیں۔ طاقتور تو اودھم مچاتے ہی رہتے ہیں۔ حکومت یہ دیکھے گی کہ وہ کسی کا حق دبانے نہ پائیں۔ ہمارے ہاں حضرت ابوبکرؓ اسلامی حکومت کے آئیڈیل ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میری حکومت میں وہ طاقت ور سب سے زیادہ کمزور ہے جس کے پاس کسی کا حق ہے جب تک کہ میں اسے نکال نہ لوں اور وہ کمزور سب سے زیادہ طاقتور ہے کہ جس کمزور کا کسی کے ذمہ حق ہے جب تک میں اس کو دلوا نہ دوں۔ یہی اسلامی حکومت کا اصل منشاء ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عوام کے ساتھ بے انصافی کرنے والی حکومت کس سزا کی مستحق ہے تو یہ بات اللہ ہی کے علم میں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسی حکومت وقت

آنے پر اپنے انجام سے دوچار ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کے تفصیلی حالات بیان کرنے کا سبب:

سوال: رسول کی قوم کی تباہی کے بعد قرآن مجید ان رسولوں کے احوال بیان نہیں کرتا سوائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہ بات ٹھیک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو قوم ہے، ان ہی کی وراثت امت مسلمہ کو ملی ہے۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو دین کی امانت دی گئی تھی انہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو منتخب کیا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے، حضرت موسیٰ کی جو شریعت تھی وہی ان کی بھی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ تورات کا ایک حرف بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔ سورہ بقرہ میں یہود کو معزول کیا گیا اور ان کی جگہ آپ کو یہ امانت دی گئی اور آپ خلافت کے حامل بنے۔ تو جس کی قوم کو معزول کیا گیا اور جس کی جگہ آپ کو دی گئی اس قوم کے حالات آپ کو پورے معلوم ہونے چاہئیں، خیر بھی اور شر بھی، اس لیے کہ اسی پیمانے سے آپ تولے جائیں گے۔ لہٰذا ان کی گمراہیاں، ان کی حماقتیں اور جو کچھ اللہ نے ان پر انعام کیا تھا وہ بھی ساری تاریخ بتا دی گئی۔ باقی رہ گئی دوسرے انبیاء کی تاریخ تو یہ صرف مجمل طریقہ پر سنا دی گئی۔ بلکہ دوسروں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ زیادہ تر پیغمبر ﷺ کی رہنمائی کے لیے بیان ہوئی ہے۔ نمایاں کردار کے خاص خاص پہلو بیان کر دیے ہیں جیسے کہ قوم لوط میں معاشرتی برائی تھی، قوم شعیب میں تجارتی گمراہی تھی۔ یہ بنیادی چیزیں بیان کر دی گئیں۔ پھر یہ ہے کہ پہلے انبیاء کے صحیفے کتاب کی شکل میں نہیں ہیں۔ پہلی آسمانی کتاب تورات ہے۔ باقی انبیاء کی تعلیم سب زبانی تھی۔ ان کی مجمل تاریخ تو آپ کے سامنے رکھی لیکن مفصل تاریخ تو نہ موجود تھی نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا بھی ہے کہ کوئی سوراخ ایسا نہیں جس میں بنی اسرائیل گھسے ہوں اور تم اس میں نہیں گھسو گے۔ تو جس قوم کی تاریخ اتنی تفصیل کے ساتھ ہمارے اوپر منطبق ہوتی ہے اس کا سنانا ضروری تھا۔ اس لیے ہمارے علماء کے لیے بھی ضروری ہے کہ تورات سے پورے طریقہ سے واقف ہوں۔ تورات کے ساتھ ہمارا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ اصلاً ہماری دینی برادری بھی یہود ہے۔ ان کی گمراہیاں، ان کی ہدایتیں دونوں ہماری تاریخ ہیں۔ اسی لیے قرآن نے بھی ان کو نمایاں کیا ہے۔

گناہ کے ساتھ کلمہ توحید کا اقرار:

سوال: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنتی ہے، چاہے وہ زانی اور چور ہی کیوں نہ ہو، یہ بات نبی ﷺ نے بہ تکرار فرمائی۔ اس حدیث کی روشنی میں نجات کی راہ بے حد آسان ہوگئی ہے۔

جواب: جو روایت مجمل ہوتی ہے وہ نصوص کو منسوخ نہیں کرتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس بات کو دین کا تکیہ بنالیں کہ ایک آدمی نے چونکہ کلمہ پڑھ لیا ہے، اب چاہے وہ چوری کرے، ڈاکہ ڈالے، زنا کرے وہ جنتی ہے، اس لیے کہ یہ بات قرآن کے نصوص کے خلاف ہے۔ قرآن نے تو یہ وضاحت کی ہے کہ جس شخص نے کوئی گناہ کیا اور فوراً ہی توبہ کر لی تو اس کے لیے معافی ہے۔ اور جس نے یہ نہیں کیا اور اسی گناہ پر مرا تو معاف نہیں کیا جائے گا۔ اس صورت میں نص قرآن اور مجمل روایت دونوں میں تطبیق دینی پڑے گی۔ اگر تطبیق نہیں ہوگی تو قرآن اصل ہوگا اور روایت ساقط کر دی جائے گی۔ اس طریقہ کی جو روایات ہیں وہ کلیات کو باطل نہیں کر دیتیں۔ یہ کہا جائے گا کہ روایت کرنے میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی ہوئی ہے۔ یہ واقعہ ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ آدمی مسلم ہوتا ہے لا الہ الا اللہ کے اقرار سے، گناہ اس کو اسلام سے خارج نہیں کرتا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھیے کہ ایک مقام وہ بھی آتا ہے جب آدمی اپنے عمل سے اسلام کی نفی کر دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اس کا دل کھنچ جاتا ہے، دوسرا کرتا ہے تو اور کھنچ جاتا ہے، یہاں تک کہ پورے کا پورا بند ہو جاتا ہے۔ یہ رین ہے اور جس کے دل پر رین ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ سیدھا دوزخ میں جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابوذرؓ کی روایت اصولی بات کو بتاتی ہے کہ آدمی اس وقت تک مسلم ہے جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہتا ہے لیکن اسلام کے جو قواعد اور شرائط ہیں ان کی وہ تفصیل نہیں کرتی۔ اسلام اپنے شرائط و قواعد ہی کے تحت باقی رہتا ہے اور اس کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ ان دونوں باتوں میں گھپلا نہ کیجیے۔

ناقدین کے ساتھ معاملہ:

سوال: اہل حدیث حضرات اور آپ کے بعض پرانے ساتھی آپ کے بعض افکار اور تحریروں پر حدیث کے حوالہ سے گرفت کرتے ہیں۔ آپ تبصرہ فرمانا پسند کریں تو نوازش ہوگی۔

جواب: میرا خیال یہ ہے کہ آپ ان کی گرفت کو دیکھیے۔ اگر مضبوط ہے تو مان لیجیے کہ ان کی گرفت

مضبوط ہے۔ لیکن اگر آپ مانتے ہیں کہ گرفت یوں ہی ڈھیلی ہے تو پھر خواہ مخواہ کو میرا پنجہ آپ کیوں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو غور سے پڑھنا چاہیے۔

میرا اصول یہ ہے کہ میں دلیل کو اہمیت دیتا ہوں، اشخاص کو اہمیت نہیں دیتا۔ بعض لوگ اشخاص کو اہمیت دیتے ہیں۔ دلیل ان کے ہاں یا تو کوئی اہمیت نہیں رکھتی یا ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ میرے نزدیک ایمان کا تقاضا اور انسان کے عاقل ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ دلیل کو اہمیت دی جائے۔ یہ بات بھی کچھ صحیح نہیں ہے کہ میں مطلق طریقہ پر مان لوں کہ مجھ سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں سب عقلمند تھے اور ان کی ہر بات ٹھیک ہے۔ یہ میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں، ان کی کوئی بات جب میرے سامنے آئے گی اور ٹھیک دلیل پر مبنی ہوگی تو مان لوں گا۔ آج بھی میں شاہ ولی اللہ صاحب کو بڑا جید عالم سمجھتا ہوں۔ جن امور میں وہ معقول بات کرتے ہیں اس کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اب یہ نہیں کہ چونکہ وہ مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں اس لیے ان کی ہر بات حق ہے۔ اگر ہر بات حق ہے تو ان کے تصوف کو بھی حق ماننا پڑے گا حالانکہ میرے نزدیک اس کو قرآن و حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ایسی لغو باتیں ہیں کہ کوئی عاقل نہیں مان سکتا۔ اسی طریقہ سے ابن تیمیہ میرے نزدیک بڑے نقاد آدمی ہیں لیکن واقعہ ہے کہ ان کی بعض رایوں سے مجھے بڑا اختلاف ہے اور میں ان کو صحیح نہیں سمجھتا۔ پس اہل حدیث ہوں یا میرے پرانے ساتھی، ان کو مجھ پر اعتراض کرنے دیجیے۔ ان کی گرفت کو دیکھیے، اگر مضبوط ہے، تب آپ یقین کریں کہ مجھ سے زیادہ کسی کی صحیح بات کو قبول کرنے میں ان شاء اللہ سبقت کرنے والا آپ نہیں پائیں گے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا فراہیؒ کا میں شاگرد ہوں لیکن اگر آپ نے تدبر قرآن پڑھی ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا جہاں مجھے اپنے استاد سے اختلاف ہوا میں نے بیان کر دیا ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ مولانا فراہیؒ کو جتنا میں مانتا ہوں میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اہل علم میں سے میں جتنا مرعوب ان سے ہوا کسی اور سے نہیں ہوا۔ اس کے باوجود قرآن کی پہلی ہی آیت میں اختلاف ہوا کہ مولانا کی رائے صحیح نہیں ہے۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا میرے پاس میری عقل نہیں ہے؟ کیا میں عقل کی بنیاد پر مکلف ہوں یا کسی اور بنیاد پر۔ اس معاملہ میں میری کسی غرض کو دخل نہیں ہے۔ آپ یقین کریں نہ میں کسی غرض سے کوئی مضمون لکھتا ہوں، نہ کسی غرض سے کسی کی رائے پر تنقید کرتا ہوں، اور نہ خواہ مخواہ کو کسی کا جھنڈا اٹھائے پھرتا ہوں۔ رہ گیا یہ کہ جو لوگ نذرانہ وغیرہ لیتے ہیں ان کی مجبوریاں ہوں گی، میں نے کبھی لیا نہیں اور لینے کی کوئی خواہش بھی دل میں نہیں پیدا ہوتی۔ میرا فلسفہ یہ ہے کہ مفت پایا ہے مفت بانٹ رہا ہوں۔ مجھے جو ملا ہے مفت ملا ہے۔

'اُمّی' کا مفہوم:

سوال: لفظ 'اُمّی' کی ذرا وضاحت فرمادیجئے۔ میرے خیال میں اردو میں اس کا ترجمہ ممکن نہیں ہے؟

جواب: میرے نزدیک سوال یہ نہیں ہے کہ اردو میں اس لفظ کا ترجمہ کیا ہے۔ اصل میں سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے لیے یہ لفظ جو استعمال ہوا وہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے لیے یہ لفظ جس معنی میں استعمال ہوا ہے اس میں ایک تو آپ کی تاریخ کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے کہ تمام آسمانی صحیفوں میں آپ کا یہ پتہ دیا گیا تھا کہ آپ امیین میں پیدا ہوں گے۔ اور امی سے مراد اسمٰعیلی عرب (بنی اسمٰعیل) ہیں۔ یہ لقب بنی اسرائیل نے بنی اسماعیل کو دیا تھا اور ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو انبیاء و رسل والے ہیں، کتاب اور شریعت والے ہیں، لیکن بنی اسمٰعیل میں کوئی نبی یا رسول نہیں آیا اور نہ ہی وہ کتاب اور شریعت سے آشنا تھے اس لیے ان کو امی کہتے تھے۔ لیکن ان امیوں کے متعلق چونکہ پیش گوئی تھی کہ آخری رسول انہی کے اندر پیدا ہوں گے۔ اس لیے نہ تو عربوں نے اس لفظ کو حقیر سمجھا اور نہ آنحضرت ﷺ نے۔

آنحضرت ﷺ کے حوالے سے اس لفظ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر چند وہ امی ہوں گا لیکن وہ ساری دنیا کا آخری رسول اور آخری معلم ہوگا۔ امی ہستم و در بغل دارم کتاب۔

اب اگر آپ اس لفظ کا ایسا ترجمہ کر سکتے ہیں کہ جس سے مذکورہ دونوں مفہوم ادا ہو جائیں تو اردو میں ترجمہ کر سکتے ہیں لیکن اگر یہ بات نہیں؟ اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو اس لفظ کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہی کہنا چاہیے کہ حضور 'نبی امی' تھے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے اور اس کی وضاحت یہ کرنی چاہیے جو اوپر میں نے بیان کی ہے۔

اگر آپ نے ترجمہ کر دیا کہ امی کے معنی Illitrate یعنی ان پڑھ، جاہل، بے خبر ہیں تو اس سے آنحضرت ﷺ کو مراد نہ لیں۔ آنحضرت ﷺ میں یہ بات نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کے لیے جب یہ لفظ بولا جائے گا تو ایک اصطلاح کے طور پر بولا جائے گا۔ اس کی ایک تاریخ ہے۔ ایک پیشین گوئی ہے۔ قرآن مجید میں اسی حیثیت سے یہ لفظ بیان ہوا: **ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم**۔ حضرت ابراہیم نے آپ کے لیے دعا فرمائی کہ اے رب میری اولاد میں سے جس کو میں نے وادی غیر ذی زرع میں بسایا ہے (مراد بنی اسماعیل ہیں) ایک نبی برپا کرنا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ و داؤد علیہ السلام یرمیاہ نبی اسعیاہ نبی وغیرہ تمام نے حضور ﷺ کی پیش گوئی کی اور اس کے بعد آخر میں حضرت عیسیٰ خاص مبشر بن کر آئے۔ ان کا مشن ہی آنحضرت ﷺ کی بشارت دینا ہے۔ "**مبشراً برسول یاتی من بعدی**

اسمه احمد" یہ قرآن میں بھی ذکر ہوا ہے اور انجیلوں میں بھی ہے۔

اب اگر کوئی صاحب اپنے لیے کہنا چاہیں کہ میں ان پڑھ ہوں اور اپنے بارے میں یہ کہیں کہ میں امی ہوں تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر مراد یہ ہے کہ جیسا آنحضرت ﷺ کو امی کہا گیا ہے تو میں بھی امی ہوں تو یہ رسول اللہ ﷺ کی تحقیر ہے اور ایسا شخص سزا کا مستحق ہے۔ اگر کوئی بیگم صاحبہ انگریزی میں ترجمہ فرمانے کے شوق میں لکھیں کہ illitrate نبی آیا تو ایسی بیگم صاحبہ کو سیدھے امریکہ بھیجنا چاہیے کہ وہاں کسی پاگل خانہ میں ان کا علاج ہو، یہاں ان کے لیے جگہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کی نسبت سے آپ ترجمہ نہیں کر سکتے۔ آپ کے لیے یہی لفظ 'امی' استعمال کریں جیسا کہ قرآن مجید نے کیا ہے۔

حج و قربانی کے بعض مسائل:

سوال: اس زمانہ میں حج بہت مشکل ہو گیا ہے۔ کیا عمرہ کو اس کا قائم مقام نہیں بنایا جا سکتا۔ نیز حج بدل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: عمرہ حج کا بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک فضیلت کا کام ہے۔ اس لیے اگر استطاعت کے باوجود ایک شخص عمرہ نہیں کرتا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ حج کا معاملہ خطرناک ہے۔ یہ بنیادی ارکان اسلام میں شامل ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مسلمان مال رکھتا ہے اور اس کو کوئی مجبوری یا معذوری نہیں ہے، پھر بھی وہ حج نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔

جہاں تک حج بدل کا تعلق ہے میرے نزدیک اگر ایک آدمی کی صدق دل کے ساتھ نیت رہی کہ وہ حج کرے لیکن کسی بیماری یا مجبوری کے تحت یا مالی وسائل نہ رکھنے کے باعث وہ حج نہ کر سکا تو اس کی اولاد یا وارثوں میں سے اگر کوئی اس کی طرف سے حج کر دے گا تو ان شاء اللہ قبول ہوگا۔ لیکن اس آدمی کی اپنی نیت نہ رہی ہو تو میرے نزدیک کسی دوسرے کا حج کرنا مفید نہ ہوگا۔

سوال: حج تمتع کرنے والے کے لیے قربانی کرنا واجب ہے۔ کیا ایسا شخص سنت ابراہیم کی قربانی سے سبکدوش ہو جاتا ہے؟

جواب: حج تمتع کرنے والے جو قربانی کرتے ہیں وہ کفارہ کی قربانی ہوتی ہے اس لیے کہ انہوں نے ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کو جمع کر لیا۔ یہ کفارہ بہر حال ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر جانور نہ ملے تو اس کے بدلے میں روزے رکھنے پڑتے ہیں۔

قربانی ایک رکن دین بھی ہے اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے۔ یہ قربانی شعائرِ حج میں سے ہے۔ اس کا اصل مقام منیٰ ہے۔ یہ اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ سے قربانی کے اونٹ بھیجتے رہے۔ ظاہر ہے کہ حضور یہ جانور تمتع کے کفارے کے طور پر نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یادگار کے طور پر بھیجتے تھے۔ ہم آپ جو قربانی عیدالاضحیٰ پر یہاں کرتے ہیں تو اس سے ہم حجاج کے ساتھ تشبہ حاصل کرتے ہیں۔ اس قربانی سے اس تمنا کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ موقع نصیب فرمائے کہ ہم ایام حج میں مکہ پہنچیں اور منیٰ میں قربانی کر کے سیدنا اسماعیلؑ کی قربانی کی یاد تازہ کریں۔

اگر حج میں لوگ صرف تمتع والی قربانی پر اکتفا کرتے ہیں تو پھر وہ اصل قربانی کہاں گئی جو حج کے شعائر میں سے ہے؟

سوال: کیا میت کی طرف سے قربانی دی جا سکتی ہے؟ بعض لوگ حج کا بے حد شوق رکھتے ہیں لیکن وسائل نہ ہونے کے باعث حج پر جا نہیں سکتے۔ ان کو سرکاری سطح پر حج کرایا جائے تو کیا یہ درست ہوگا؟

جواب: میت کی اولاد اور قریبی عزیز جس طرح میت کا قرض ادا کر دیں تو وہ ادا ہو جاتا ہے اسی طرح اگر میت کی نیت رہی ہو اور اس کی طرف سے وہ حج یا قربانی کریں تو ان شاء اللہ میت کو اس کا ثواب مل جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت میں مرنے والے کا دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اولاد کے نیک اعمال میں بھی شریک ہو جاتا ہے۔ غیر متعلق لوگوں کے میت کی طرف سے عمل کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میرے نزدیک ایک مرنے والے کی خواہش اور نیت کا ہونا شرط ہے۔ اگر ایک آدمی قربانی ہی کے خلاف رہا ہو تو آپ اس کی طرف سے عرب کے سارے اونٹ بھی ذبح کر دیں تو اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

حج کے لیے استطاعت ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک شخص اس کے وسائل نہیں رکھتا تو اس پر سے حج ساقط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کی رخصت دے رکھی ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک سرکاری حج کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا عمل تو یہ ہے کہ میں سرکاری حج کرنے والوں سے دعا کی درخواست بھی نہیں کرتا۔ آپ لوگ اس کے قائل ہوں تو کرتے رہیں۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

نئی اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

تالیف: امام حمید الدین فراہی — ترجمہ و ترتیب: خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80 روپے

اصول فہم قرآن

مصنف: مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب: عبداللہ غلام احمد

موضوعات

● فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
1. قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
2. قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
3. قرآن حق و باطل کے امتیاز کی کسوٹی ہے۔
4. قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
5. قرآن قطعی الدلالۃ ہے۔
● [illegible]
● [illegible]

قیمت -/34 روپے

[illegible]

مصنف - [illegible]

● [illegible]
● [illegible]
● [illegible]
● [illegible]

قیمت -/36 روپے

"[illegible] کافی ہے۔ اس سے عربی زبان سمجھنے کی راہ ہموار ہو جائے گی" مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث، [illegible] لاہور
2- دار التذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور